میرے ہمدم میرے دوست

فرحت اشتیاق

میرے ہمدم میرے دوست

گیٹ پر بیل ہوئی تھی۔ سیڑھیوں سے اوپر اپنے کمرے میں کھڑے ہوئے بھی اس نے بیل
آواز بہت آسانی سے سن لی تھی۔

اب وہ اپنے کانپتے ہوئے وجود کو سنبھالتے ہوئے ایک آخری نگاہ اس گھر پر ڈال رہی تھی۔ یہ گھر جہاں
کا بچپن گزرا' جہاں وہ زندگی کے کتنے سارے سال اپنی ماں کے ساتھ رہی اور جہاں اس کی ماں نے اپنی بیما
کا سخت ترین وقت گزارا اور پھر اسی گھر میں اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔

زیادہ پرانی بات تو نہیں تھی۔ پرسوں صبح ہی کی تو بات تھی۔ صبح کے چار بجے انہوں نے زندگی سے شکس
کھائی تھی۔ بیڈ پر بچھی ہوئی چادر بھی وہی تھی جس پر وہ لیٹی ہوئی تھیں۔ پاس پڑی میز پر ابھی تک ان کی دوائ
رکھی تھیں۔ کل رات میں بھابی نے اس کا سارا سامان پیک کیا تھا۔ اس کے کپڑے اور دیگر ضروری سامان۔

وہ چپ چاپ بیڈ پر بیٹھی انہیں اپنا سامان پیک کرتا دیکھتی رہی تھی۔ امی کی دوائیاں' ان کے مختلف ٹیسٹس
رپورٹس' ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کے فون نمبرز یہ سب جو پچھلے دو سالوں سے اس کی زندگی کے ساتھ جڑے
اب بالکل بے معنی ہو چکے تھے۔

محض چند گھنٹوں میں بھابی نے اس کا سامان پیک کر ڈالا تھا۔ اس گھر میں ایسا تھا بھی کیا جو وہ ساتھ
جا سکتی۔ وہ پرانے زمانے کا فرنیچر جسے وہ زبردستی جھاڑ پونچھ کر صاف کرنے کے جتن کیا کرتی تھی یا کچن

ہ وہ بالکل سستی سی کراکری جو اس قابل بھی نہیں تھی کہ کسی اتنے امیر معزز مہمان کی آمد کے موقع پر اسے کلف چائے ہی پیش کی جا سکے۔

کتنے سارے خواب تھے اس کے۔ وہ گریجویشن کے بعد کہیں جاب کرے گی اور ساتھ ہی پرائیویٹ ایم ے کی بھی تیاری کرے گی۔ آہستہ آہستہ وہ ترقی کرتی جائے گی۔ اپنے اس گھر کا وہ نقشہ بدل دے گی مگر وہ کچھ ی نہیں بدل پائی تھی۔

اس کے بی اے کے پہلے سال کے امتحان چل رہے تھے جب امی بیمار ہوگئی تھیں۔ ان کی سب جمع پونجی ان کے علاج میں خرچ ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ امی کا سارا زیور جو انہوں نے زندگی میں مشکل سے مشکل وقت آنے پر بھی کبھی بیچنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا' وہ تک اس نے ان کے علاج کی خاطر بیچ ڈالا تھا۔

یہ زیورات ان کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہوسکتے تھے۔

وہ سوچتی تھی امی ٹھیک ہوجائیں گی پھر میں انہیں زیور بیچنے کے بارے میں بتادوں گی۔ وہ بہت ناراض ہوں گی' یہ سوچ کر فکرمند ہوں گی کہ میری شادی کے لیے ان زیورات کے علاوہ ان کے پاس اور تو کوئی چیز ہی نہیں لیکن کوئی بات نہیں۔ میں انہیں منالوں گی لیکن زندگی نے یہ موقع ہی نہیں آنے دیا تھا۔ اب اس گھر میں ایسی کوئی قیمتی چیز نہیں بچی تھی جو وہ اپنے ساتھ لے جاسکتی' سوائے ان یادوں کے جن میں اس کی ماں تھی وہ خود تھی اس کا بچپن تھا۔

ایک سوٹ کیس اور ایک ہینڈ بیگ یہ اس کی کل متاع تھی اور یہ سامان باقر بھائی پہلے ہی نیچے لے جاچکے تھے۔ زینت خالہ' بھابھی' باقر بھائی اور عارف بھائی سب اس کے لیے فکرمند تھے۔ وہ جانتی تھی ان سب کو اس سے بہت زیادہ ہمدردی ہے۔ وہ اس کا خیال کررہے ہیں۔ کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے ان مشکل ترین دنوں میں اسے بہت سہارا دیا تھا۔ آج صبح محض ان کا دل رکھنے کی خاطر اس نے چائے کے چند گھونٹ لیے تھے۔ انہوں نے اس کے ساتھ ناشتا کیا تھا۔ اسے اس بات پر دلاسا دینے کی کوشش کی تھی کہ کیا ہوا اگر اس کی ماں اس سے چھن گئی ہے تو؟ اس کا سگا باپ زندہ ہے اور اب وہ اپنے باپ کے پاس جارہی ہے۔ اپنے اس باپ کے پاس جسے اس نے زندگی میں ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا جو اس کے نزدیک اتنی سی اہم بھی نہیں تھی کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے خود آتا۔

اسے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یقیناً کوئی اسے بلانے اوپر آرہا تھا۔ اس نے ایک آخری حسرت بھری نگاہ ان درودیوار پر ڈالی جو کل تک اس کا گھر تھا' ساری دنیا میں اس کے لیے سب سے پیاری جگہ' کہیں بھی جاتی یہاں واپس آنے کے لیے اس کے قدم خوشی خوشی اٹھا کرتے تھے۔

''ایمن! وہ آگئے ہیں تمہیں لینے۔'' بہت تیز تیز سیڑھیاں چڑھنے سے بھابی کی سانس پھول گئی تھی۔ وہ جواب میں کچھ بولے بغیر خاموشی سے ان کے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگی۔ انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

''حوصلہ کرو ایمن! تم کہیں انجان لوگوں میں تو نہیں جارہیں۔ اپنے باپ کے پاس جارہی ہو۔ دادا' پھر کراچی جیسے شہر میں جارہی ہو۔ وہاں کی تیز رفتار بھاگتی دوڑتی زندگی اور چکاچوند میں دیکھنا کتنی جلدی تمہارا دل لگ جائے گا۔''

اس نے اسی خاموشی مگر تشکر آمیز نگاہوں سے بھابھی کو دیکھا۔ امی کی بیماری کے ان دو سالوں میں زینت خالہ اور ان کے گھر کے تمام افراد نے اس کا اور امی کا بہت ساتھ دیا تھا حالانکہ ان کا ان لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ یہ ماں بیٹی ان لوگوں کی صرف کرایہ دار تھیں۔ کبھی رات میں امی کی حالت بگڑتی تو باقر بھائی یا عارف بھائی میں سے کوئی جاکر ٹیکسی لے آتا اور پھر اس کے ساتھ ہسپتال بھی چلا جاتا۔

وہ زینت خالہ اور ان کے گھر کے ایک ایک فرد کی احسان مند تھی۔

وہ بھابھی کے ساتھ چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آگئی۔ سامنے ہی صوفے پر وہ شخص بیٹھا ہوا تھا جسے اس کے باپ نے اسے لینے کے لیے بھیجا تھا۔ بڑی مشکلوں سے وہ خود میں اتنی قوت پیدا کرپائی تھی کہ آنسوؤں پیچھے دھکیل کر اسے سلام کرے۔

''السلام علیکم۔'' اس نے اپنا لہجہ ہموار رکھنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔

''وعلیکم السلام۔'' وہ اس کی آمد سے قبل باقر بھائی سے کوئی بات کررہا تھا' ان کے ساتھ اپنی بات ادھور چھوڑ کر اس نے فوراً ہی صوفے پر سے اٹھتے ہوئے اس کے سلام کا جواب دیا۔

''آپ تیار ہیں؟'' اس کا مہذب سا لہجہ کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ اس پر سے نظریں ہٹا کر وہ جلدی جلدی باقر بھائی اور زینت خالہ سے الوداعی کلمات کہنے لگا تو وہ دونوں اسے چائے وغیرہ کے لیے روکنے پر اصرار کرنے لگے۔ ان لوگوں کے بے تحاشا اصرار کے جواب میں بھی رکنے کے موڈ میں نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے انداز میں بہت عجلت تھی۔ ایسے جیسے وہ جلد سے جلد یہاں سے چ جانا چاہتا تھا اور اس کے اس انداز کو محسوس کرنے کے باوجود بھی باقر بھائی اور زینت خالہ اس سے رکنے پر اصرا کررہے تھے۔

پیسے میں اتنی ہی طاقت ہوتی ہے۔ اس شخص کا ہر ہر انداز پکار پکار کر اس کی امارت کا اعلان کررہا تھا۔ اس ک لباس' اس کی نشست برخاست' اس کی گفتگو' گیٹ کے باہر کھڑی اس کی قیمتی گاڑی۔ اگر وہ کوئی معمولی سا آد ہوتا' معمولی سی گاڑی میں آیا ہوتا تو اس غرور اور تکبر کے مظاہرے کے بعد وہ لوگ اس سے رکنے کے لیے ذرا بھی اصرار نہیں کرتے۔

پانچ منٹ کے اس اصرار اور انکار کے بعد وہ سب لوگوں سے خدا حافظ کہتے ہوئے گیٹ تک آگئی۔ گھر کے سب افراد اسے گیٹ تک الوداع کہنے آئے تھے۔ زینت خالہ' بھابھی' گڑیا سب اس سے گلے لگ کر رو رہے تھے۔ کراچی جاکر ان لوگوں سے رابطہ رکھنے کے وعدے لے رہے تھے اور وہ اتنی دیر میں باقر بھائی کے ہاتھ سے اس کا سوٹ کیس لے کر گاڑی کی ڈگی میں رکھ چکا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ اور اس کے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھولے وہ اپنی گاڑی کے پاس کھڑا اس کے فار

ہونے کا منتظر تھا۔ وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے سب لوگوں نے ایمن کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔ اس نے بھی جواباً زبردستی چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے ہاتھ ہلا دیا تھا۔

اسے پرسوں شام باپ کے ساتھ ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو بھی یاد آ رہی تھی جس کے دوران یہ شخص بھی اس کے باپ کے پاس ہی موجود تھا۔ وہ امی کی تدفین کے بعد پڑوسیوں اور چند دوسری جان پہچان والی خواتین کے درمیان گھری بیٹھی تھی۔

وہ اس قیمتی ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں بیٹھی خود کو اپنے گھر سے، اپنے لوگوں سے، اپنے شہر سے دور جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کے تصور میں اس کی ماں کی بالکل تازہ قبر آ رہی تھی۔ پتا نہیں کوئی وہاں جا کر فاتحہ پڑھا بھی کرے گا کہ نہیں؟ وہ کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتی تھی اور بہت کچھ سوچے بھی جا رہی تھی۔

وہ جن لفظوں میں ہمدردی کر رہی تھیں اور جس طرح اس کے ہولناک مستقبل کی تصویر کشی کر رہی تھیں ان کی باتیں سنتے ہوئے مسلسل اس بات پر رو رہی تھی کہ اب وہ دنیا میں اکیلی کس طرح جیے گی۔

اسے ان لوگوں کی باتوں سے بہت ڈر لگ رہا تھا، بہت وحشت ہو رہی تھی، مگر وہ انہیں چپ نہیں کروا سکتی تھی۔ اسی وقت بھابھی کے ساتھ نیچے آ گئی تھی۔ زینت خالہ فون پر بات کر رہی تھیں۔

''ایمن آ گئی ہے۔ آپ اس سے بات کر لیں۔'' اسے آتا دیکھ کر انہوں نے ان سے کہا اور پھر ریسیور اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے بولیں۔

''تمہارے والد کا فون ہے۔'' اس نے ریسیور ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے باپ سے بات کرنے جا رہی تھی لیکن نہ اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا اور نہ وہ کسی قسم کی خوشگواریت محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنے چہرے سے آنسو صاف کرتے ہوئے ریسیور کان سے لگا کر انہیں سلام کیا۔ اس کے دل میں کوئی ہلچل نہیں ہو رہی تھی۔ حالانکہ اس ایک فون کال کا اس کی ماں کو کتنی شدت سے انتظار تھا۔

اپنی زندگی کے آخری بیس بائیس دن انہوں نے اسی فون کال کا انتظار کیا تھا۔ اس کے سلام کا انہوں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ زینت خالہ انہیں امی کے انتقال کی خبر پہلے ہی دے چکی تھیں اس لیے اب وہ آگے کی بات کر رہے تھے۔

''میں اور الماس آج رات امریکہ جا رہے ہیں۔'' اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد انہوں نے جیسے کچھ سوچتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔ وہ ان کے منہ سے اتنی غیر متعلقہ بات سن کر ساکت رہ گئی۔ اس شخص سے اس نے زندگی میں کبھی کوئی امیدیں وابستہ نہیں کی تھیں لیکن پھر بھی اتنا غیر انسانی رویہ اس کے دل کو شدید تکلیف سے دوچار کر گیا تھا۔ وہ عورت اگر ان کی کچھ بھی نہیں لگتی تھی تب بھی وہ ان کی بیٹی کی ماں تو تھی۔ کیا ایک انسانی زندگی اتنی سی بھی اہمیت نہیں رکھتی۔ انہوں نے نہ اس کی ماں کے مرنے پر کوئی تعزیتی جملہ بولا اور نہ زندگی میں پہلی مرتبہ بیٹی سے مخاطب ہونے پر اس کی خیریت دریافت کی تھی۔

''حیدر! تمہیں کل حیدر آباد جانا ہے ناں؟'' کچھ دیر بعد اس نے ان کی آواز سنی۔ وہ اب اس سے مخاطب نہیں تھے۔ وہ غالباً اپنے قریب موجود کسی فرد سے کوئی بات کر رہے تھے۔ وہ شخص یقیناً بالکل پاس ہی بیٹھا ہوا تھا کیونکہ اس کا جواب بھی اس نے بالکل واضح طور پر سنا تھا۔

''جی توفیق بھائی! کل شام میں جانا ہے اور شادی میں شرکت کر کے رات میں ہی واپسی کا ارادہ ہے۔'' وہ چپ چاپ ریسیور کان سے لگائے کھڑی تھی۔

وہ دونوں اب آپس میں جو بھی بات کر رہے تھے، وہ اسے سن نہیں پا رہی تھی۔ چند سیکنڈز بعد اس نے دوبارہ اپنے باپ کی آواز سنی۔ وہ اب اس سے مخاطب تھے۔

''پرسوں صبح حیدر تمہیں لینے آئے گا۔ حیدر مسعود۔ کل کا دن تمہیں مل رہا ہے اس میں اپنی ساری پیکنگ کر لو جب تک میں اور الماس امریکہ سے واپس نہیں آ جاتے، تم حیدر کے گھر پر ہی رہو گی۔ پریشان مت ہونا، میں امریکہ سے جلدی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔''

پتا نہیں اس کی پریشانی کا خیال انہیں کیونکر آ گیا تھا یا پھر شاید یہ جملہ یونہی اخلاقاً بولا گیا تھا۔ اگر اس نے اپنی مری ہوئی ماں سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو وہ اسی وقت فون پر اس شخص کو جو اس کا باپ تھا خود پر یہ عظیم الشان احسان کرنے سے روک دیتی۔

وہ کہیں بھی چلی جاتی اسی گرلز ہوسٹل میں یا کہیں بھی، مگر اس شخص کا احسان کبھی قبول نہ کرتی، مگر اس شخص کو خط لکھنے کے بعد اس کی ماں نے ان گزرے تمام دنوں میں ہر روز اس سے ایک ہی بات کہی تھی۔

''ایمن! میرے بعد تم توفیق کے پاس چلی جانا۔ یہ دنیا بہت ظالم ہے۔ تم تنہا کیسے رہو گی۔ وہ تمہارا باپ ہے۔ اگر بے شک محبت نہیں بھی کرے گا تب بھی وہاں تم محفوظ تو ہو گی۔''

ان بیس بائیس دنوں میں انہوں نے ہر روز اس سے یہ وعدہ لیا تھا۔ اپنی قسم دے کر، اپنی محبت کا واسطہ دے کر۔ وہ جیسے اس بات سے بخوبی آگاہ تھیں کہ وہ اپنے باپ سے کتنی سخت نفرت کرتی ہے۔ اسی لیے اتنی شدت سے ہر روز اس سے وعدہ لیا کرتی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ امی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی، وہ نہ زندگی میں کبھی تنہا ہو گی اور نہ ہی اسے کسی دوسرے فرد کے پاس جانے کی کوئی ضرورت پیش آئے گی۔

مگر امی اسے اپنے وعدے کا پابند بنا کر مجبور کر گئی تھیں اور اب جب وہ اس اجنبی شخص کے برابر گاڑی میں بیٹھی تھی تو اور بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن اس شخص کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ نجانے وہ اس کے باپ کا کیا لگتا تھا۔ بہرحال ان دونوں کا آپس میں جو بھی تعلق تھا وہ شخص اس کے بارے میں یہ تو ضرور سوچ رہا ہو گا کہ معلوم نہیں اس کی ماں میں ایسی کیا خرابی تھی جو اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے باپ کا دل بیوی کی طرف سے صاف نہیں ہوا۔

کتنا حقیر اور کمتر سمجھا ہو گا اس نے اسے، جس لڑکی کی اس کے باپ کے نزدیک محض اتنی سی اہمیت ہو کہ وہ اسے اپنے پاس بلانے کے لیے کسی انجان آدمی کو بھیج دے۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے خود کو رونے سے روکتے کی

کوشش کرتے کرتے وہ اس کے برابر میں گاڑی میں بیٹھتے ہی خود سے ہار گئی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالنے اور رونے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی۔ مگر اس پل آنسوؤں پر بند باندھنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ اس نے اپنا منہ پورا کا پورا کھڑکی کی طرف کرلیا۔

وہ بے آواز رو رہی تھی۔ کوئی سسکی' کوئی آواز اس کے منہ سے نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بالکل ساکت بیٹھی کھڑکی سے باہر سڑک پر نظریں جمائے آنسو بہا رہی تھی۔ وہ خود کو رونے سے نہیں روک سکتی تھی تو کم از کم اپنے برابر بیٹھے شخص سے اپنا رونا تو چھپا ہی سکتی تھی۔

یونہی خاموشی سے بے آواز آنسو بہاتے اسے نجانے کتنی دیر گزری ہوگی جب اچانک اس نے اس شخص کی آواز سنی۔ وہ اس سے مخاطب تھا۔ بڑی سرعت سے' بہت احتیاط اور بڑی بے ساختگی میں اس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ جلدی سے صاف کیا۔ محض دو سیکنڈز کے اندر اس نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کھڑکی کی طرف سے اپنا منہ ہٹایا اور اپنی سیٹ پر بالکل سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''آپ پانی پی لیجیے۔'' اس نے اپنا جملہ دہرایا۔ اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا' اس کا ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھا' نگاہیں ونڈ اسکرین پر تھیں اور دوسرا ہاتھ جو اس نے اس کی طرف بڑھایا ہوا تھا اس میں منرل واٹر کی بوتل تھی۔ وہ اتنا لاتعلق بھی نہیں تھا جتنا وہ اسے سمجھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھے بغیر وہ جانتا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ شاید وہ ضرورت سے زیادہ ذہین تھا یا شاید اس کی حسیات بہت تیز تھیں یا پھر شاید وہ اس وقت اس بے چاری اور مجبور لڑکی سے سوائے رونے کے کسی اور بات کی امید ہی نہیں رکھتا تھا۔

اس کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا لگ رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی اس کے ہاتھ سے پانی کی بوتل لے لی۔ اس نے ایک بار بھی ایمن کی طرف نہیں دیکھا تھا' وہ اسی طرح ڈرائیونگ کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے پانی کی بوتل لے لینے پر اس نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی اسٹیئرنگ پر رکھ لیا۔ بوتل کھول کر اس نے اسے جلدی سے منہ سے لگا لیا۔ بغیر سانس لیے وہ پانی کے کتنے ہی گھونٹ پی گئی۔ بوتل بند کرتے ہوئے اس نے خود کو تھوڑی دیر پہلے والی کیفیت کے مقابلے میں خاصا بہتر محسوس کیا۔

''آپ چائے پئیں گی؟'' اس کی نگاہیں بدستور ونڈ اسکرین پر تھیں۔ اس کے لیے جیسے شیشے سے اس پار نظر آتی سڑک اور آگے پیچھے بھاگتی' دوڑتی گاڑیوں اور بسوں کے علاوہ دوسری کوئی چیز دیکھے جانے کے لائق نہیں تھی۔

ایمن نے بوتل اس کی طرف بڑھائی تو اس نے بوتل ہاتھ میں لینے کے لیے پل کی پل ونڈ اسکرین سے نگاہیں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی نگاہیں ہٹا لیں۔

''شکریہ' میں نے چائے گھر پر پی لی تھی۔'' اس کا لہجہ ابھی بھی اس کے آنسوؤں کی چغلی کھا رہا تھا۔

''تکلف مت کریں۔ چائے کے لیے خاص طور پر کہیں رکنا نہیں پڑے گا۔ میرے پاس تھرماس میں چائے ہے۔'' اس نے دوبارہ ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھے تھرماس کی طرف اشارہ کیا۔

''میں تکلف نہیں کر رہی۔'' اس کے بہت ہی مہذب اور شائستہ قسم کے لہجے کے جواب میں اس نے آہستگی سے کہا۔ اس نے مزید اصرار نہیں کیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اس سے لاتعلق ہو کر ڈرائیونگ میں مگن ہو چکا تھا۔

کم از کم اس سفر کے دوران اس اجنبی کے برابر بیٹھ کر تو وہ اب ہرگز بھی نہیں رونا چاہتی تھی اسی لیے اب وہ قصداً ایسی باتیں سوچنے لگی تھی جنہیں سوچتے ہوئے اس کا ذہن ماضی' حال اور مستقبل کی الجھنوں سے باہر آجائے۔

حیدر آباد اور کراچی اتنے قریب ہیں یہ بات اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ جانی تھی۔ وہ اپنی کولیگ سے' باقر بھائی سے اور بعض دوسرے جاننے والوں سے اکثر کراچی کے تذکرے سنا کرتی تھی۔ وہ بہت سالوں سے جانتی تھی کہ اس شہر میں اس کا باپ رہتا ہے پھر بھی کبھی اس کا دل نہیں چاہا تھا یہاں آنے کو۔ آج جب اس شہر میں آئی تھی تو بھی اس کا دل وہیں اس کے پیارے شہر کی گلی کوچوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔

اس کے برابر میں بیٹھا شخص اس مختصر سی گفتگو کے بعد باقی سارا راستہ اس سے یکسر لاتعلق تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ خود وہ اپنی گود میں دھرے دونوں ہاتھوں پر نگاہیں جمائے اس نئے شہر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ گاڑی اب ایک رہائشی علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے نظریں دوڑا کر اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کوئی پوش علاقہ تھا۔ بہت بڑے بڑے مکانات جن کی دیواریں بہت اونچی تھیں اور گیٹ بھی بہت بڑے تھے۔ وہ ان گھروں کو باہر سے دیکھ کر ہی ان میں رہنے والے مکینوں کی امارت کا اندازہ کر سکتی تھی۔ ان ہی پرشکوہ مکانات میں سے ایک سیاہ گیٹ والے مکان کے سامنے لا کر اس نے گاڑی روک دی۔ گاڑی کا ہارن سنتے ہی چوکیدار نے فوراً گیٹ وا کیا۔ اس شاندار مکان کے وسیع و عریض پورچ میں پہلے ہی سے تین گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گئی۔ ایک ملازم ٹائپ بندہ تیزی سے چلتا ہوا اپنے مالک کے پاس آیا۔

''گاڑی میں سے سوٹ کیس نکال کر کمرے میں رکھ آؤ۔'' اس نے ملازم کے سلام کا جواب دیتے ہوئے گاڑی کی چابیاں اس کے ہاتھ میں پکڑائیں۔ ملازم سر ہلاتا ہوا گاڑی کی طرف مڑ گیا۔

''آیئے ام ایمن۔'' اب کی بار وہ اس سے مخاطب تھا۔ براہ راست اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔

''ام ایمن۔'' اس نے خود بہت تعجب سے اپنا نام دہرایا۔ یہ اس کا پورا نام تھا' یہ اس کا اصلی نام تھا۔ مگر اس کے گرد موجود لوگوں میں سے کوئی بھی اسے اس نام سے نہیں پکارتا تھا۔

آج پہلی مرتبہ کسی نے اسے اس طرح اس کے پورے نام کے ساتھ مخاطب کیا تھا۔ اسے اپنا نام اس طرح لیا جانا بڑا اجنبی سا لگا۔

''آیئے۔'' وہ اس کے قریب پہنچی تو اس نے ایک بااختیار میزبان کی طرح مہمان کو پہلے اندر جانے کا موقع دیا۔ وہ اس گھر کا لاؤنج تھا یا ڈرائنگ روم وہ ایک نظر میں اندازہ نہیں کر سکی۔ اسے بس اس بات کا اندازہ ہوا تھا کہ وہ کمرہ بڑی خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ سامنے صوفے پر ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کو اندر

داخل ہوتا دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھیں۔

‘‘ام ایمن! یہ میری بی بی ہیں۔ میری پھوپھی، میں انہیں بی بی بولتا ہوں۔’’ اس نے ان خاتون کا اس سے تعارف کروایا جب کہ انہیں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔ غالباً وہ اپنے گھر میں ایک بن بلائے مہمان کی آمد سے پہلے ہی باخبر تھیں۔ کچھ جھجکتے ہوئے اس نے انہیں سلام کیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ان لوگوں کا اس کے باپ کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ اسے انہیں کیا کہہ کر مخاطب کرنا چاہیے۔

‘‘بہت افسوس ہوا بیٹا! تمہاری والدہ کے بارے میں سن کر۔’’ اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر میں صوفے پر بٹھاتے ہوئے انہوں نے بہت افسوس سے کہا۔

وہ راستہ بھر خود کو ہر قسم کی سوچوں سے بچا کر رونے سے روکتی آئی تھی مگر اس وقت ان کے تعزیتی جملے نے یک دم ہی اس کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر آنسو بھر دیے۔

‘‘میرا خیال ہے، آپ اپنے کمرے میں جا کر فریش ہو لیں۔’’ وہ اس کے اور بی بی کے عین سامنے والے صوفے پر بیٹھا اسی سے مخاطب ہوا۔

‘‘بی بی! آپ نے ایمن کے لیے کمرہ ٹھیک کروا دیا تھا نا؟’’ اس نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بی بی سے دریافت کیا تو انہوں نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

‘‘کل شام میں ہی پروین سے کمرہ ٹھیک کروا دیا تھا۔ آؤ بیٹا! میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔ تم منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو لو پھر لنچ کریں گے۔’’

وہ اسے اپنے ساتھ لے کر ایک کمرے میں آ گئیں۔ اس کے سوٹ کیس اور بیگ پہلے سے وہاں موجود تھے۔

وہ کمرہ بھی قیمتی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔

‘‘جب تک توفیق اور الماس واپس نہیں آ جاتے تم ہم لوگوں کے ساتھ ہی رہو گی۔ اس گھر کو بالکل اپنا گھر سمجھ کر رہنا۔ تکلف کرنے کی بالکل کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے یا حیدر سے بے جھجک بولنا۔’’ اے سی آن کرتے ہوئے انہوں نے اسی محبت بھرے انداز میں اس سے کہا۔ وہ جواباً خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔

‘‘اچھا اب میں باہر جا رہی ہوں۔ تم فریش ہو لو۔ وہ سامنے باتھ روم ہے۔’’ اس کے گال ہولے سے چھوتے ہوئے انہوں نے اسے اس طرح مخاطب کیا جیسے وہ ایک ننھی سی بچی ہو۔

یہ کون لوگ تھے؟ یہ اس کی اتنی پروا کیوں کر رہے تھے؟ جب اس کے سگے باپ کو اس کی کوئی پروا نہیں تو انہیں کیوں تھی؟ یا پھر اس کا باپ ان لوگوں سے یہ بات کہہ کر گیا تھا کہ میری بیٹی کا اچھی طرح خیال رکھنا۔ کس بات کو صحیح سمجھے، وہ کس بات کو غلط سمجھے۔ اب اس کمرے میں اسے روتا ہوا دیکھنے والا کوئی بھی موجود نہیں تھا اسی لیے وہ پوری آزادی کے ساتھ رو رہی تھی۔ اس شاندار ڈبل بیڈ پر بیٹھی وہ اپنے گھر کے کونے کونے کو یاد کر کے رو رہی تھی۔

یونہی روتے ہوئے اسے شاید پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے بہت گھبرائے ہوئے انداز میں جلدی جلدی دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کیے اور اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔

‘‘السلام علیکم۔’’ مسکراتے ہوئے اس نے کہا پھر اس کے جواب دینے سے پہلے ہی مزید گویا ہوئی۔

‘‘مجھے بی بی نے یہاں بھیجا ہے تاکہ میں سوٹ کیس میں سے نکال کر آپ کے سارے کپڑے الماری میں رکھ دوں اور اگر ابھی پہننے والے کپڑے آپ کو استری کروانے ہیں تو وہ بھی مجھے دے دیں۔’’ وہ کمرے کے اندر آ گئی۔

وہ اسے یہ بات بتا نہیں سکتی تھی کہ اس نے زندگی بھر کبھی اپنا کوئی کام کسی ملازم سے نہیں کروایا۔ اس کی زندگی میں ان چیزوں کا کہیں کوئی گزر تھا ہی نہیں۔ اسے اپنے کپڑے خود دھونے اور خود استری کرنے کی عادت تھی بلکہ صرف دھونے اور استری کرنے ہی کیوں وہ تو اپنے کپڑے سیا بھی خود کرتی تھی۔ اس لیے کہ کسی درزی سے کپڑے سلوانا وہ افورڈ کر نہیں سکتی تھی۔

‘‘میرا نام پروین ہے۔ میں شروع ہی سے یہیں پر کام کرتی ہوں بلکہ میں تو پیدا ہی اسی گھر میں ہوئی ہوں۔ میری اماں بھی یہیں پر کام کرتی ہے۔ ابا میرا گاؤں میں رہتا ہے۔ وہ وہاں حیدر بھائی کی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔’’ وہ سوٹ کیس میں سے اس کے کپڑے باہر نکالتے ہوئے اسے اپنے بارے میں بتانے لگی۔

‘‘بی بی نے کل مجھے آپ کے آنے کے بارے میں بتایا تھا۔ ویسے تو اپنی طرف سے میں نے یہاں پر ضرورت کی سب چیزیں رکھ دی تھیں، پھر بھی اگر کوئی چیز کم ہے تو آپ مجھے بتا دیں۔’’ الماری میں اس کے کپڑے رکھتے ہوئے اس نے مزید کہا۔

اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی بلا کی باتونی تھی۔ اس کی مسلسل خاموشی بھی اسے خاموش ہونے پر مجبور نہیں کر رہی تھی۔

‘‘بہت شکریہ، فی الحال مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔’’ بڑی مشکلوں سے خود کو بولنے پر آمادہ کر کے اسے جواب دیتے ہوئے وہ باتھ روم میں گھس گئی۔

کافی دیر بعد وہ باتھ روم سے باہر نکلی تو پروین وہاں سے جا چکی تھی۔ دس منٹ بعد دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اپنی اسی مسکراہٹ سمیت۔

‘‘آپ کا کھانے پر انتظار ہو رہا ہے۔’’ یہ اس کا گھر نہیں تھا جہاں وہ اپنی مرضی چلاتی۔

‘‘مجھے بھوک نہیں، میرا کھانا کھانے کا موڈ نہیں۔’’

قسم کا کوئی بدتمیز سا جملہ بول سکتی۔ وہ یہاں مہمان تھی۔ اسے یہاں ہر طرح کی اخلاقیات نبھانی تھیں۔ اسے یہاں مینرز کا بہت زیادہ خیال رکھنا تھا۔ وہ شانوں پر دوپٹہ سلیقے سے پھیلاتی ہوئی پروین کے ساتھ ڈائننگ روم میں آ گئی۔ ان کے اصرار کے باوجود بھی اس کا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے اس میز پر سجی انواع و اقسام

نئی ڈشز کو دیکھ کر بھی بھوک کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اگر وہ کچھ کھائے گی تو اسے الٹی ہو جائے گی۔

"بی بی! لگتا ہے آج کھانا آپ نے خود بنایا ہے۔" حیدر کی بات پر بی بی نے اس پر سے اپنی توجہ ہٹائی۔

"ہاں یہ سلاد اور مچھلی میں نے خود بنائی ہے۔" ان کے جواب پر وہ بولنے سے ہنسا تھا۔

"پتا تھا مجھے کہ آج لنچ پر آپ میرے لیے کچھ نہ کچھ اپنے ہاتھ سے ضرور بنائیں گی۔ کتنے سارے دنوں بعد آج ہم چھٹی کا دن ساتھ گزار رہے ہیں۔ وہاں واصف مجھ سے ولیمہ میں شرکت کے لیے بہت اصرار کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا، اتنے دنوں بعد تو آج چھٹی کا دن میں بی بی کے ساتھ گزارنے والا ہوں، ولیمہ کی وجہ سے رک گیا تو یہ سنڈے بھی یونہی گزر جائے گا۔"

وہ دونوں اب آپس میں مصروف ہو گئے تھے۔ وہ اس سے پہلے اس شادی کے بارے میں پوچھنے لگی تھیں جس میں شرکت کے لیے وہ حیدر آباد گیا تھا۔ وہ مختلف لوگوں کے نام لے کر ان کی خیریت دریافت کر رہی تھیں۔ وہ منظر سے ہٹ جانے پر خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہی تھی۔ بی بی کی ساری توجہ اب حیدر کے ساتھ گفتگو میں تھی۔ درمیان میں اخلاقاً وہ کوئی نہ کوئی ڈش اس کے پاس رکھ تو رہی تھیں مگر پہلے کی طرح بضد نہیں ہو رہی تھیں۔ اسے پتا نہیں کیوں یونہی وہم سا ہوا کہ اس نے جان بوجھ کر بی بی کی توجہ اس پر سے ہٹوائی ہے۔ کھانا ختم کر کے جب حیدر اپنی کرسی سے اٹھا تو بی بی نے اپنی پلیٹ پیچھے سرکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے بالکل بھی ٹھیک طرح کھانا نہیں کھایا۔" وہ اس کے لیے یوں فکرمند ہو رہی تھیں جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ وہ جواب میں کچھ بولے بغیر ان کی طرف دیکھ کر اخلاقاً مسکرائی۔

حیدر ڈرائنگ روم سے باہر جا چکا تھا۔

"تم بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو ایمن......! میرا خیال ہے تھوڑی دیر سو جاؤ۔ اس سے تمہاری طبیعت بہتر ہو جائے گی۔" ان کے لہجے میں اس کے لیے بزرگانہ سا پیار موجود تھا۔ وہ جیسے سمجھ رہی تھیں کہ ماں کے مرنے کے اس تیسرے دن میں وہ کس طرح کی اذیت اور دکھ سے گزر رہی تھی۔

ان کے کہنے پر کمرے میں آ تو گئی تھی لیکن بیڈ پر لیٹنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بہت سی سوچیں جگہ بنائے ہوئے تھیں۔ کبھی وہ امی کے بارے میں سوچنے لگتی، کبھی اپنے باپ کے بارے میں، کبھی اپنے مستقبل کے بارے میں، زندگی میں آگے کیا ہونے والا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔ اس کے دل کو اتنی ساری فکریں لاحق تھیں کہ وہ سونے اور آرام کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ اتنی دیر میں اس کے بیٹھنے کے انداز میں بھی ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس طرح ایک ہی جگہ جم کر بیٹھنے سے اس کا پورا جسم اکڑ گیا تھا۔ وہ صوفے پر سے اٹھ کر بیڈ پر آ گئی مگر وہ بستر پر لیٹ کر ادھر ادھر کروٹیں بدلنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر رہی تھی۔ نو بجے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے خود ہی اندازہ لگایا کہ اسے رات کے کھانے کے لیے بلایا جا رہا ہے۔

پھر دستک دینے کے ساتھ آہستہ آواز بھی دی گئی تھی۔

"ایمن۔" وہ پہچان گئی یہ بی بی کی آواز تھی۔

لیکن وہ ان کی آواز سن کر بھی ڈھیٹ بنی لیٹی رہی۔

انہوں نے دوبارہ دستک دینے کے بجائے کمرے کا دروازہ کھول لیا۔ اسے بند آنکھوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کمرے کے اندر آ گئی ہیں۔ قدموں کی چاپ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔

"سو رہی ہے ایمن۔" بیڈ سے کچھ فاصلے پر رک کر اسے بغور دیکھتے ہوئے انہوں نے جیسے خود کلامی کی۔ ان کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"جی بی بی! میں اٹھا دوں انہیں۔" یہ آواز پروین کی تھی۔ وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے خود کو سوتا ہوا ظاہر کر رہی تھی۔

"نہیں، اسے سونے دو۔ پتا نہیں بے چاری کتنی راتوں کی جاگی ہو گی۔ مجھے بس یہ فکر ہو رہی ہے کہ یہ بھوکی سو گئی ہے۔" ان کی آواز اب پہلے سے بھی زیادہ ہلکی تھی۔

پھر اسے صرف واپس پلٹتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ جب کمرے کا دروازہ واپس بند ہونے کی آواز اس نے سن لی تو آنکھیں کھول کر کمرے میں دیکھا۔ وہ جاتے ہوئے نائٹ بلب جلا گئی تھیں۔

کمرے میں اب اتنا گھپ اندھیرا نہیں تھا، جتنا تھوڑی دیر پہلے تھا۔ وہ خاموش لیٹی ایک ٹک چھت پر لگے فانوس کو گھورے جا رہی تھی۔ لیٹے لیٹے اچانک اس کی نظر گھڑی پر پڑی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔ دس بجے امی کو دوا دینی تھی۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا۔" وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے فوراً بیڈ پر کھڑی ہوئی۔ بیڈ پر سے اٹھتے ہی اس نے کچھ فاصلے پر بچھے دوسرے سنگل بیڈ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ نہ وہ بیڈ وہاں تھا اور نہ امی وہاں تھیں۔ وہ ایک دم اچانک جیسے ہوش میں آئی تھی۔

اس کا چیخ چیخ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسی دیوار پر اپنا سر مار مار کر رو دے۔ اس کے لیے دنیا میں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ ایک رشتہ جو اسے میسر تھا، وہ بھی اس سے چھن گیا تھا۔ اس کے پاس تو کوئی ایسا بھی نہیں تھا جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ رو سکے۔ یہ غم اس اکیلی کا غم تھا۔ اس غم کو اس کے ساتھ بانٹنے کے لیے کوئی موجود نہیں تھا۔

وہ وحشت زدہ ہو کر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ کمرے سے باہر نکل کر اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا تھا۔ وہ اندھیرے میں یونہی اندازوں سے چلتی ہوئی پتا نہیں کہاں جا رہی تھی۔ اس کا بس یہ دل چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ دیر بالکل کھلے آسمان کے نیچے کھڑی ہو۔ وہاں کوئی دیواریں اور کوئی چھت نہ ہو۔

یونہی اندازوں سے چلتے چلتے اس نے ایک دروازہ کھولا تو باہر سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوا نے اسے اس بات کا احساس دلایا کہ اس نے صحیح دروازہ کھولا ہے۔ وہ اس دروازے سے باہر نکل آئی۔ وہ اس گھر کا پتا نہیں کون سا حصہ تھا۔ لیکن وہ جگہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی اس وقت اسے درکار تھی۔ وہ باغ تھا، لان تھا نجانے کیا تھا، اندھیرے

میں وہ اندازہ نہیں کر پائی۔ وہاں صرف ایک گارڈن لائٹ جل رہی تھی۔

وہ کتنی بڑی اور کھلی کھلی سی جگہ تھی۔ اندھیرے سے اس کی آنکھیں تھوڑی مانوس ہوئیں تو اسے سوئمنگ پو نظر آیا۔ وہ سوئمنگ پول کے بالکل پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ رات کے اس پہر وہ پانی کتنا ساکت اور کتنا ادا لگ رہا تھا۔ وہاں اس کی اکلوتی گارڈن لائٹ کے علاوہ کوئی دوسری روشنی بھی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان طرف دیکھا تو اسے پتا چلا کہ یہ دوسری روشنی چاند کی روشنی ہے۔ وہ پانی میں نظر آتے چاند کے عکس کو دیکھ ہوئے خاموشی سے سوئمنگ پول کے پاس بیٹھ گئی۔

”کیا بات ہے ام ایمن! آپ کو نیند نہیں آ رہی؟“ اپنے عقب میں اس نے یہ مردانہ آواز سنی اور وہ پوری پوری ہل گئی۔ کچھ خوف اور بے بسی کے احساس میں گھرے ہوئے اس نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت اسے اپنی یہاں موجودگی کا کیا سبب بتائے گی؟ کیا یہ کہے کہ اسے نیند نہیں آ رہی تھی، اس لیے وہ خوری کے لیے یونہی رات کے بارہ بجے سوئمنگ پول کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

پہلے ہی دن اس کے گھر میں آ کر وہ بے تکلفانہ انداز میں اس کے گھر میں ادھر ادھر گھومتی پھر رہی تھی۔ اپنے یوں باہر نکل آنے پر اب بری طرح شرمندہ ہو رہی تھی۔

چند سیکنڈز اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد وہ خود بھی اس سے کچھ فاصلے پر وہیں سوئمنگ پول کے پاس بیٹھ گیا۔

”میں ٹیرس پر کھڑا تھا۔ مجھے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ آپ کو یہاں دیکھا تو میں نے سوچا کہ مجھے جا کر پوچھ چاہیے کہ کیا بات ہے۔“ اس کا انداز بڑا سادہ سا تھا۔ ایسے جیسے وہ برسوں سے اس کے گھر میں رہتی رہی تھی۔

اس نے کچھ گھبرائے ہوئے انداز میں خود سے کچھ فاصلے پر بیٹھے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اس کی زندگی میں باقر بھائی اور عارف بھائی کے علاوہ کسی مرد کا کوئی گزر نہیں تھا۔ وہ کبھی کو ایجوکیشنز میں نہیں پڑھی تھی۔ وہ اس وقت اس شخص سے کیا کہے؟ یا کچھ بھی کہے بغیر یونہی اٹھ کر شان بے نیازی سے اندر چلی جائے۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

”میں بھی آپ کے ہی جتنا تھا جب میری ممی کا انتقال ہوا تھا۔“ اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بہت آہستہ آواز میں بولا۔ ایمن نے بہت چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں پڑھنے کے لیے امریکہ گیا ہوا تھا۔ میرے پیچھے ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں پہلی فلائٹ سے کراچی آیا مگر انہیں زندہ نہیں دیکھ پایا تھا۔“ وہ اب بھی بڑی آہستہ آواز میں بول رہا تھا۔ اس کی آواز میں موجود دکھ وہ بہت اچھی طرح پہچان سکتی تھی اس لیے کہ اس دکھ سے اس وقت وہ خود بھی گزر رہی تھی۔

”وہ کیا بیمار تھیں؟“ اس کے سوالیہ انداز میں کوئی تجسس نہیں تھا۔ صرف دکھ تھا۔

”وہ بالکل بھی بیمار نہیں تھیں۔ بس اچانک ہی۔ میں تو کراچی سے جاتے وقت انہیں بالکل صحت مند اور ہنستا مسکراتا ہوا چھوڑ کر گیا تھا۔ فون پر پاپا نے مجھے ان کی بیماری کی اطلاع دی حالانکہ حقیقت میں تو اس وقت ان کا

انتقال ہو چکا تھا۔ میں یہاں آیا تو پتا چلا کہ ممی مجھ سے ملے بغیر، کوئی بات کیے بغیر ہی چلی گئی ہیں۔“ اس کی بات سنتے سنتے وہ رو پڑی۔

”آپ روئے تھے؟“ اس نے روتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”ہاں، میں بہت رویا تھا۔ اس عمر میں ایسا لگتا ہے ناں کہ ہم بہت بڑے ہو گئے ہیں، اب ہمیں کسی کے سامنے رونا نہیں چاہیے۔ پھر میں تو لڑکا بھی تھا۔ میرے لیے تو یہ بات اور بھی زیادہ شرمندگی کا باعث تھی کہ میں کسی کے سامنے روؤں، چاہے وہ میرے پاپا اور بی بی ہی کیوں نہ ہوں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں مجھے ایسا لگنے لگا تھا کہ میں بہت بڑا ہو گیا ہوں۔ بے وقوف تھا میں۔ مجھے یہ بات پتا ہی نہیں تھی کہ دکھ چھپانے سے نہیں بلکہ کسی کے ساتھ شیئر کر لینے سے کم ہوتے ہیں۔“ وہ بڑی سنجیدہ نگاہوں سے اسے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کی ممی کو تو کوئی بیماری نہیں تھی، لیکن میری امی بہت بیمار تھیں۔ وہ پچھلے دو سالوں سے بیمار تھیں۔ وہ بہت تکلیف میں تھیں۔“ روتے ہوئے اس نے اپنے گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔

ماضی، حال اور مستقبل کو ذہن سے نکال کر صرف اور صرف اس بات پر کہ اسے جنم دینے والی وہ ہستی جس سے اسے بے پناہ محبت تھی ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ گئی ہے۔ وہ ان تین دنوں میں اس وقت پہلی مرتبہ صرف اور صرف امی کے لیے رو رہی تھی۔

”میں نے ان کی صحت کے لیے اتنی دعائیں مانگی تھیں۔“ وہ اسی طرح گھٹنوں پر سر رکھ کر روتے ہوئے بول رہی تھی۔ ”سب کہہ رہے تھے کہ ان کے حق میں یہی بہتر ہوا ہے۔ وہ اتنی تکلیف میں تھیں مزید زندہ رہتیں تو مزید تکلیف جھیلتیں مگر مجھے ان باتوں سے تسلی نہیں ہوتی۔ آپ بتائیں، آپ نے کیا کیا تھا؟ آپ کو صبر کس طرح آیا تھا؟ مجھ سے تو یہ دکھ جھیلا نہیں جا رہا۔“ اس نے اپنے گھٹنوں پر سے سر اٹھا کر آنسو بہاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”وقت ام ایمن۔ صرف اور صرف وقت۔“ وہ اسی سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”وقت خود بخود تمہارے زخموں پر مرہم رکھ دے گا۔ وقت خود بخود ہی تمہیں صبر بھی دے دے گا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ دکھ اب بھی میرے ساتھ ہے مگر یہ اب مجھے رلاتا نہیں ہے۔ میں نے اس دکھ کے ساتھ سمجھوتا کر لیا ہے، صبر کر لیا ہے۔ پھر زندگی میں اس ایک دکھ کے علاوہ بے شمار خوشیاں بھی تو ہیں۔“ وہ بلک بلک کر روتے ہوئے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

اس شخص سے پہلے بھی ان تین دنوں میں بہت سے لوگوں نے اسے تسلیاں اور دلاسے دیے تھے مگر کسی تسلی اور کسی دلاسے سے اس کے دل کی بے قراری کم نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے لفظوں میں نجانے ایسا کیا اثر تھا کہ اس کے دل کو قرار آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید وہ جو کہہ رہا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ شاید آنے والے دنوں میں وقت واقعی اس کے اس زخم پر مرہم رکھ دے گا۔ وہ جس طرح اپنی ماں کا ذکر کر رہا تھا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے اپنی ماں سے کتنی شدید محبت تھی، جب اتنی شدید محبت کے باوجود اس نے اس غم کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تو پھر وہ بھی ضرور ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ وہ اب دوپٹے سے اپنے بھیگے ہوئے چہرے کو خشک کر رہی تھی۔

‘‘اندر چلیں؟’’ کھڑے ہوتے ہوئے اس نے ایمن سے پوچھا تو وہ فوراً ہی کھڑی ہو گئی۔ خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ دونوں اندر آ گئے۔ وہ اسے ساتھ لیے کچن میں آ گیا۔

کچن کی لائٹ آن کرتے ہوئے وہ اس سے مخاطب ہوا۔ ‘‘بیٹھو ام ایمن۔’’ اس نے کچن ٹیبل کے آگے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کچھ حیران سی ہوتی کرسی پر بیٹھ گئی۔

‘‘تمہیں میرا تم کہنا برا تو نہیں لگا؟’’ کیبنٹ میں سے کچھ نکالتے ہوئے اس نے اس سے پوچھا۔

‘‘تم مجھے خود سے اتنی چھوٹی لگیں کہ آپ جناب کرنا بڑا بے وقوفانہ سا لگ رہا تھا۔ ویسے بائی دا وے تمہاری عمر کتنی ہے؟’’ اس کی ہونق سی شکل کو دیکھ کر وہ بردباری سے بولا۔

‘‘مجھے پتا ہے، کسی لڑکی سے اس کی عمر پوچھنا مینرز کے خلاف سمجھا جاتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تمہاری عمر ابھی اتنی نہیں ہے کہ تم عمر پوچھے جانے پر برا مانو گی۔’’ وہ مذاق کر رہا تھا یا سنجیدہ تھا وہ سمجھ نہیں پائی۔ اس کے چہرے کے تاثرات تو بہت سنجیدہ قسم کے ہی تھے۔ ایک پلیٹ میں بسکٹ رکھ کر وہ پلیٹ اس کے پاس لے آیا۔

‘‘بائیس سال آٹھ مہینے۔’’ اس نے مہینوں کے حساب کتاب کے ساتھ اس طرح اپنی عمر بتائی کہ وہ اس کے اس سادگی بھرے انداز پر بڑی مشکلوں سے اپنی بے ساختہ ہنسی چھپا پایا۔

‘‘تھوڑا سا میرا اندازہ غلط ہو گیا۔ میں تمہیں سترہ یا اٹھارہ سال کا سمجھ رہا تھا۔ خیر پھر بھی تم مجھ سے کافی چھوٹی ہو۔ میں چونتیس سال کا ہوں۔ مہینوں کا حساب کتاب اس لیے شامل نہیں کر سکتا کیونکہ پچھلے ہفتے ہی میں نے اپنی چونتیس ویں سالگرہ منائی ہے۔’’ وہ پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے واپس مڑ گیا۔

‘‘گویا کہ تم مجھ سے بارہ سال چار مہینے چھوٹی ہو اور اتنے بڑے فرق کے ساتھ تو مجھے پورا حق حاصل ہے، تم سے تم کر کے بات کرنے کا۔’’ وہ اب کوکنگ رینج کے پاس کھڑا تھا۔

‘‘چائے پیو گی ناں؟’’ اس کے سوال پوچھنے کے انداز میں اتنا یقین شامل تھا جیسے کہ اس کے انکار کا کوئی جواز ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

‘‘ویسے میں کوئی بہت اچھا کک نہیں ہوں لیکن چائے اور کافی بنانے میں بہرحال مجھے خاصی مہارت حاصل ہے۔ تمہیں میرے ہاتھ کی بنی چائے پسند آئے گی۔’’ وہ اس کے جواب میں ہاں یا نہ کہنے سے پہلے ہی مزید گویا ہوا۔ پانچ منٹ میں ہی اس نے چائے تیار کر لی۔

‘‘تم چینی کتنی لو گی؟’’ شوگر پاٹ اٹھاتے ہوئے اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

‘‘ایک چمچ۔’’ اس کا چائے پینے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اب جب وہ چائے بنا ہی چکا تھا تو وہ نخرے نہیں دکھا سکتی تھی۔ اس کے اور اپنے کپ میں چینی ملاتے ہوئے وہ میز کے پاس آ گیا۔

‘‘پیو میرے ہاتھ کی بنی گرما گرم مزے دار سی چائے۔’’ اس نے ایک حیرت بھری نگاہ اس پر اور ایک کچن میں لگی گھڑی پر ڈالی جو ڈیڑھ بجا رہی تھی۔ رات کے ڈیڑھ بجے وہ اتنے خوشگوار انداز میں اس کی خاطر مدارات کر رہا تھا جیسے دن کا ڈیڑھ بجا ہو۔

اس کا کپ اس کے آگے رکھ کر وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چائے کا گھونٹ لینے کے لیے وہ ک
اٹھانے لگی تو وہ کچھ ناراضی بھرے انداز میں بولا۔

‘‘یہ بسکٹ میں نے سجانے کے لیے یہاں نہیں رکھے تھے۔ کم سے کم دو بسکٹ تمہیں لازمی کھانے ہیں۔’’

‘‘میرا دل نہیں چاہ رہا۔’’ وہ آہستہ سے بولی۔

‘‘کھانا دل چاہنے پر نہیں، بھوک لگنے پر کھایا جاتا ہے اور تمہیں بھوک لگنی چاہیے بلکہ لگ رہی ہے۔
پتا ہے یہ بات، تم نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟’’ اس کا انداز قطعیت بھرا تھا۔
کے کہنے پر اسے خود بھی یاد آ گیا کہ اس نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا۔ وہ اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگو
بغور دیکھ رہا تھا۔

‘‘ہمارے بھوکا رہنے سے جانے والے واپس نہیں آ سکتے۔ کیا بھوکی رہ کر تم اللہ کے ساتھ اپنی ناراض
اظہار کر رہی ہو۔ چونکہ اس نے تمہاری دعائیں قبول نہیں کیں، اس لیے اب تم اس کے دیے کھانے کو ہاتھ
لگاؤ گی۔ کیا ہمیں اللہ کے ساتھ ناراض ہونے اور ضد کرنے کا کوئی حق ہے؟ ہم نہیں جانتے ہمارے لیے کیا
ہے۔ جو کچھ بظاہر ہمیں غلط ہوتا ہوا لگ رہا ہوتا ہے وہی درحقیقت ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔’’ اتنی دیر
پہلی مرتبہ اس نے ناصحانہ انداز اپنایا تھا۔ اس کی بات مکمل ہوتے ہی اس نے فوراً ہی پلیٹ میں سے ایک بس
اٹھا لیا اور اسے کھانا بھی شروع کر دیا۔

‘‘شاباش تمہاری جیسی اچھی لڑکی اللہ کے ساتھ ضد کرتی اور ناراض ہوتی بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔’’
کے لبوں پر ہلکی سی اپنائیت بھری مسکراہٹ تھی۔

وہ بسکٹ کھاتے ہوئے اس کے چہرے پر نظر آتی اس اپنائیت کو تعجب سے دیکھ رہی تھی جب کہ وہ ا
حیرت سے انجان اب اپنی چائے کا سپ لینے لگا تھا۔

‘‘ایک اور لو یہ بٹر کوکیز ہیں۔ میری فیورٹ جب میں انہیں کھا رہا ہوں تو چار پانچ سے کم پر کبھی نہیں
تمہیں کیا یہ اچھے نہیں لگ رہے؟’’ اسے چائے کا کپ اٹھاتے دیکھ کر اس نے کچھ مصنوعی سی حیرت سے پو
اسے اس وقت کسی چیز کا ذائقہ پتا نہیں چل رہا تھا اور وہ بھی یہ بات سمجھتا تھا لیکن پھر بھی اس طرح کی بات
تھا۔ اس نے خاموشی سے دوسرا بسکٹ اٹھا لیا۔ وہ آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ لے رہا تھا، اس نے اب
نظریں ایمن پر سے ہٹا لی تھیں۔ اچانک ہی اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اس سے یہ بات پوچھے کہ اس کا
کے باپ کے ساتھ کیا رشتہ ہے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سوال کس طرح کرے۔ اسے یہ
پوچھتے ہوئے جھجک ہو رہی تھی لیکن وہ کوئی مناسب قسم کے الفاظ ڈھونڈنے میں ناکام ہو گئی۔ کچھ بے بسی
کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنا چائے کا کپ اٹھا لیا۔

‘‘کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟’’ وہ ہکا بکا ایک مرتبہ پھر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔

‘‘زیادہ حیران مت ہو۔ تمہارے چہرے پر اتنا بڑا سوالیہ نشان بنا ہوا ہے کہ فوراً ہی پتا چل رہا ہے

کچھ پوچھنا چاہتی ہو۔" وہ اس کی ہونق شکل دیکھ کر مبہم سا مسکرایا۔

"میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ......" وہ بولتے بولتے ہچکچا کر خاموش ہوگئی تھی۔ آگے کا جملہ اس نے اپنے اندر ہی روک لیا تھا۔

"وہ آپ کے کیا لگتے ہیں؟" وہ اس سوال سے کیا سمجھتا اس لیے نرمی سے بولا۔

"پوچھو ام ایمن! تم جو کچھ بھی پوچھنا چاہتی ہو' مجھ سے بے جھجک پوچھ سکتی ہو۔" اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اس طرح کی تھی جیسے وہ اسے بات کرنے کے لیے حوصلہ دینا چاہ رہا تھا۔ "میں ان کے بارے میں۔" وہ بولتے بولتے پھر خاموش ہوگئی۔

"تم توفیق بھائی کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے رسانیت سے پوچھا۔ اس نے بے ساختہ سر اثبات میں ہلا دیا۔

"وہ کب واپس آئیں گے' یہ پوچھنا چاہتی ہو؟" اس کا لہجہ بہت نرم اور دھیما سا تھا۔ اس نے منہ سے کچھ بولے بغیر سر نفی میں ہلا دیا۔

"پھر؟" خود سے مزید کوئی اندازے لگانے کے بجائے اس نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں یہ پوچھنا چاہ رہی تھی' آپ کا ان سے کیا رشتہ ہے؟" اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا اور وہ اس کی بات سن کر بے ساختہ ہنس پڑا۔

"اتنی سی بات پوچھتے ہوئے تم اتنا گھبرا رہی تھیں۔ میں سمجھا' پتا نہیں کیا بات ہے۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ یہ بات تمہیں اس قدر پریشان کر رہی ہے تو تمہیں کراچی آتے ہوئے راستے ہی میں اس بارے میں بتا دیتا۔" کچھ شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنی نظریں اس کے مسکراتے چہرے پر سے ہٹا لیں۔

"ہم فیملی فرینڈز ہیں' بزنس پارٹنرز ہیں۔ ہم دونوں کو بزنس میں ساتھ کام کرتے ہوئے گیارہ سال ہوگئے ہیں۔ پہلے میرے پاپا' توفیق بھائی اور جمیل انکل بزنس سنبھالتے تھے۔ مجھے امریکہ سے واپس آئے گیارہ سال ہوگئے ہیں۔ میرے واپس آنے کے بعد صرف ایک سال پاپا اور جمیل انکل بھی ہمارے ساتھ کاروبار میں موجود رہے پھر آگے پیچھے ان دونوں کی ڈیتھ ہوگئی تو اب بزنس ہم دونوں مل کر سنبھالتے ہیں۔ جمیل انکل میرے اور میری فیملی کے لیے بالکل ایسے تھے جیسے ہمارے انتہائی قریبی رشتہ دار۔ جمیل انکل' الماس آپی کے۔" وہ روانی سے بولتا بولتا یک لخت ہی خاموش ہوگیا۔

"تم نے چائے ختم نہیں کی؟" اس نے اچانک ہی بات بدل دی۔ وہ تفصیلاً اسے کیا بات بتانے والا تھا' یہ تو وہ نہیں جانتی تھی' لیکن یہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی سوتیلی ماں کا اس کے سامنے نام لیتے ہی اسے خود اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ اپنی سوتیلی ماں کا ذکر اس کے لیے ہرگز خوشگوار نہیں ہوسکتا' اس نے بغیر کچھ کہے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ کپ میں موجود چائے بالکل ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ اس نے ایک ہی گھونٹ میں وہ باقی بچی ہوئی چائے ختم کر لی تھی۔

"توفیق بھائی کا امریکہ جانا بہت ضروری تھا۔ پچھلے دو مہینوں سے ان کا جانا کسی نہ کسی وجہ سے ٹل رہا تھا۔

انہیں وہاں سائر کے پاس جانا تھا۔ وہ بوسٹن پڑھنے گیا ہوا ہے۔ جانتی ہو ناں تم سائر کو؟" بولتے بولتے اس
کچھ سوچ کر اس سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"سائر ان کا بیٹا ہے' تمہارا بھائی ہے۔" تمہارا بھائی کا لفظ جیسے اس نے جان بوجھ کر استعمال کیا تھا۔
رشتہ ایک انجانے لڑکے کے ساتھ جوڑنے کے لیے۔ وہ چہرے پر کوئی تاثر لائے بنا خاموشی سے اس کی
دیکھتی رہی۔

"اسے بوسٹن گئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے۔ میرا خیال ہے چار پانچ مہینے ہی ہوئے ہیں۔ وہ وہاں
ایڈجسٹ نہیں کر پا رہا۔ وہ اصل میں وہاں جا کر پڑھنے میں اتنا انٹرسٹڈ بھی نہیں تھا۔ توفیق بھائی نے اسے
وہاں بھیجا ہے۔ اس کا وہاں دل نہیں لگ رہا اور اس پریشانی میں وہ وہاں بیمار ہوگیا ہے۔ کافی دنوں سے
بھائی' سائر کے پاس امریکہ جانا چاہ رہے تھے لیکن کوئی نہ کوئی مصروفیت ایسی نکل رہی تھی کہ ان کا جانا
چلا جا رہا تھا۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے بہت آہستہ آہستہ اور بڑی احتیاط سے بول رہا تھا۔

"تمہاری امی کا خط انہیں بہت دیر سے ملا۔ اصل میں خط ان تک پہنچنے میں کچھ گڑبڑ ہوگئی تھی۔ غلطی
کس کی تھی شاید میری سیکریٹری کی یا ان کی سیکریٹری کی یا پیون کی۔ بہرحال ہوا کچھ یوں کہ تمہاری امی کا
سے میری ڈاک میں شامل ہوگیا۔ میں پچھلے دنوں پاکستان میں تھا نہیں۔ آفس کے کام سے زیورچ گیا ہوا
پچیس چھبیس دنوں بعد میری واپسی ہوئی۔ واپس آکر اس روز میں پہلی مرتبہ آفس گیا تھا۔ اس
توفیق بھائی نے حیدرآباد تمہارے گھر فون کیا تھا۔ میں نے آفس جا کر سب سے پہلے اپنے لیے موجود
اور اپنی ڈاک ہی دیکھی تھی۔ وہ خط دیکھا تو پتا چلا کہ یہ تو توفیق بھائی کے لیے ہے اور اسے یہاں آئے
پچیس چھبیس روز ہوچکے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اس خط کو پہلے ہی توفیق بھائی تک پہنچنے میں خاصی
ہے۔ مجھے اسے پہلی فرصت میں ان تک پہنچا دینا چاہیے۔

وہ اس دن امریکہ جا رہے تھے اسی لیے آفس نہیں آئے تھے۔ میں خط لے کر ان کے گھر ہی
نے سوچا تھا کہ انہیں خدا حافظ بھی کہہ آؤں گا اور یہ خط بھی انہیں دے دوں گا۔ اس وقت میں خود بھی نہیں
کہ یہ خط اس قدر اہم ہے۔ تم یقین کرو کہ میرے ہاتھ سے خط لے کر اسے پڑھتے ہی انہوں نے اسی
تمہیں فون کیا تھا۔ اس وقت ان کے جانے کی سب تیاری ہوچکی تھی۔ ان کے ایئرپورٹ جانے کے
نکلنے میں چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ وہ رک نہیں سکتے تھے۔

اگر خط انہیں پہلے مل جاتا تو وہ شاید اپنا جانا کینسل کر دیتے اور خود جا کر تمہیں حیدرآباد سے لاتے
تم پریشان مت ہو۔ وہ زیادہ دنوں کے لیے نہیں گئے ہیں۔ میرا خیال ہے بہت سے بہت وہ بیس
واپس آجائیں گے۔" جو باتیں اس کے باپ کو اس سے کرنی چاہیے تھیں وہ سب انجان شخص اس کے
تھا۔ وہ اس کے احساسات کی پروا کر رہا تھا وہ جیسے سمجھ سکتا تھا کہ اسے کیا بات ہرٹ کر رہی ہے۔
اس کے دل میں موجود سب بدگمانیاں دور کر دینا چاہتا تھا۔ آج صبح سے پہلے وہ اس آدمی کو جانتی

تھی' اس نے اسے زندگی میں کبھی دیکھا تک نہیں تھا' کبھی اس کا نام تک نہیں سنا تھا اور آج رات میں وہ اس انجان آدمی کے ساتھ بیٹھی اپنی انتہائی پرسنل باتیں کر رہی تھی۔ وہ جیسے اس کے اندر تک جھانک لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں نظر آتا غصہ' نفرت اور بدگمانی بڑی آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔

وہ جو اس کی باتیں سنتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی' اس نے ایک دم ہی کچھ گھبرا کر اپنی نظریں جھکا لیں۔ وہ اپنے باپ کے لیے کیا سوچتی ہے' وہ انہیں کیسا انسان سمجھتی ہے' یہ سب کچھ وہ اس اجنبی سے چھپا لینا چاہتی تھی۔ چند لمحوں تک وہ اس کے جھکے ہوئے سر کو بغور دیکھتا رہا۔

''تمہیں نیند آ رہی ہے یا ابھی بھی سونے کا دل نہیں چاہ رہا؟'' کچھ دیر بعد اس نے اس کی مدھم سی آواز سنی۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''سر کس بات پر ہلایا ہے؟ نیند آتے والی پر یا سونے کا دل نہیں چاہ رہا والی بات پر؟'' وہ اس کے سر ہلانے پر مسکراتے ہوئے بولا۔

''نیند آنے والی بات پر۔'' اس کے دوستانہ سے اپنائیت بھرے انداز نے اسے بے ساختہ اور بے جھجک بولنے پر مجبور کر ہی دیا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا کرسی پر سے اٹھا تو وہ بھی اٹھ گئی۔

''کمرے میں جا کر سونے کی کوشش کرنا۔ تمہارے لیے نیند بہت ضروری ہے۔ بستر پر لیٹ کر دوسری کوئی بھی بات مت سوچنا سوائے اس کے کہ تم بہت تھکی ہوئی ہو اور تمہیں سخت نیند آ رہی ہے۔'' کچن سے باہر نکلتے ہوئے وہ سمجھانے والے انداز میں بولا اور پھر اسے شب بخیر کہہ کر سیڑھیوں کی طرف جانے لگا۔ وہ اس کے آگے بڑھ جانے کے باوجود اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی تھی۔ دو قدم آگے بڑھتے ہوئے اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ایمن ابھی تک وہیں کھڑی ہے۔ اس نے گردن موڑ کر بہت تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا پرابلم ہے ام ایمن؟ تم کیا کوئی اور بات بھی پوچھنا چاہتی ہو؟'' وہ واپس اس کے پاس آ گیا۔ وہ جھنجھلایا ہوا نہیں تھا' بس اس کے چہرے پر حیرت تھی۔

''مجھے یاد نہیں آ رہا' میرا کمرہ کس طرف ہے۔'' اسے اندازہ تھا کہ وہ اس کی بات سن کر ہنسے گا' اسی لیے سر جھکا کر شرمندگی سے اپنی بے وقوفی کا اعتراف کیا۔

''آؤ۔'' اس کے چہرے پر ہلکی سی اپنائیت بھری مسکراہٹ تھی' اسے ساتھ لے کر آتے ہوئے وہ اس کے کمرے کے دروازے پر آ کر رک گیا۔ ''اب نہ رونا ہے اور نہ کچھ سوچنا ہے۔ صرف سونا ہے' ٹھیک ہے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے دروازہ کھول کر کمرے میں آ گئی جبکہ وہ واپس سیڑھیوں کی طرف مڑ گیا تھا۔

وہ کمرے میں آ کر لیٹ تو گئی تھی' لیکن نیند اسے ابھی بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے ہوتے والی ساری باتیں یاد کر رہی تھی۔ وہ انجان آدمی' جسے وہ ڈھنگ سے جانتی تک نہیں ہے۔ وہ اس کا کچھ بھی تو نہیں لگتا تھا۔ لیکن اس کا انداز اتنا مختلف کیوں تھا؟ وہ عام لوگوں سے اتنا مختلف کیوں لگ رہا تھا؟ وہ اس طرح کیوں بات کر رہا تھا جیسے اسے اس کی بہت پروا ہے؟ وہ اگر روئی تھی تو اس میں کمزوری سے زیادہ اس کی اپنائیت کو دخل تھا۔

وہ اتنی اپنائیت سے' اتنے خلوص سے بات کر رہا تھا کہ وہ اپنے آنسو روک ہی نہیں پائی تھی۔ اسی بات کو سوچتے سوچتے اسے نجانے کب نیند آ گئی تھی۔

* * *

صبح اس کی آنکھ آٹھ بجے کھلی تھی۔ یہ وہ گھر نہیں تھا' یہ وہ کمرہ نہیں تھا جہاں ہر صبح آنکھ کھلنے پر وہ خود کو موجود پایا کرتی تھی۔ چند لمحوں تک وہ بیڈ پر بیٹھی خاموشی سے اس کمرے کو دیکھتی رہی۔

اسے رات کو بی بی کا خود اسے کھانے کے لیے بلانے آنا بھی یاد آ گیا۔ وہ رات جیسی بدتمیزی کا مظاہرہ اس وقت نہیں کر سکتی تھی۔ دروازہ کھول کر باہر نکلی اور ابھی کوریڈور سے ہوتی ہوئی لاؤنج کی طرف جا رہی تھی کہ سامنے سیڑھیوں پر سے حیدر اترتا نظر آیا۔ وہ بریف کیس ہاتھ میں لیے تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ خوشگوار سے انداز میں مسکرایا۔

''تم اتنی جلدی اٹھ گئیں؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ وہ جواباً بغیر کچھ بولے تکلفانہ تھوڑا سا مسکرائی۔ وہ آفس جانے کے لیے تیار نظر آ رہا تھا۔ کل اس نے بہت عام سی ڈریسنگ کر رکھی تھی۔ ہاف سلیوز کی وائٹ کلر کی ٹی شرٹ اور خاکی کلر کی جینز جبکہ اس وقت وہ بڑے شاندار طریقے سے تیار تھا۔

اس نے کل سے لے کر آج تک ایک بار بھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ وہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔ اس وقت پہلی مرتبہ اسے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ وہ بہت ہینڈسم ہے۔ اس کا قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی گرے کلر کی آنکھوں میں ذہانت بھی تھی اور خوب صورتی بھی۔

اس کے سیڑھیوں سے اتر کر اپنے پاس آنے کے دوران وہ اس کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ اس مختصر سے جائزے کے بعد اس نے خود پر نظریں دوڑائیں۔ کل صبح کا پہنا ہوا کاٹن کا تھری پیس سوٹ جو شکنوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے لاشعوری طور پر ہاتھوں سے اپنے کپڑوں کی شکنیں دور کرنے کی کوشش کی۔

''آ جاؤ ام ایمن۔ ہم دونوں ساتھ ناشتہ کر لیتے ہیں۔'' وہ اس جگہ پر خود کو مس فٹ محسوس کر رہی تھی۔ شکل و صورت اس کے اختیار میں نہیں تھی' لیکن اپنا حلیہ درست رکھنا تو اس کے اختیار میں تھا۔ اسے کمرے سے کپڑے بدل کر اور بال بنا کر باہر نکلنا چاہیے تھا۔ وہ بے چارہ مروت میں اس کے ساتھ اچھی بات کر رہا ہے' اسے اپنے ساتھ ناشتے کی آفر کر رہا ہے' ورنہ اس وقت ام ایمن سے بہتر حلیہ تو اس کی ملازمہ کا تھا۔ وہ غم میں ہے' سوگ منا رہی ہے تو ساری دنیا تو مل کر اس کے ساتھ سوگ نہیں منائے گی دنیا تو ظاہر کو دیکھتی ہے۔

اس کے پیچھے ڈائننگ روم میں آتے ہوئے اس نے ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑی صاف ستھری ملازمہ کے کپڑوں کے ساتھ اپنے کپڑوں کا موازنہ کیا۔

''بیٹھو۔'' وہ بہت زیادہ کلچرڈ تھا۔ مہمان کے بیٹھنے سے پہلے اس نے اپنی کرسی نہیں سنبھالی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھی تو وہ بھی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا لوگی تم ناشتے میں؟'' اس کے اس سوال پر اس نے میز پر ایک نگاہ دوڑائی۔ وہ صرف چائے پینا چاہتی تھی۔ ''آملیٹ لوگی؟'' پروین نے آملیٹ کی پلیٹ لا کر میز پر رکھی تو اس نے فوراً ایمن سے آملیٹ کھانے کے

بارے میں پوچھا۔

پروین وہاں سے واپس کچن میں چلی گئی جبکہ اس کی ماں ابھی یہیں موجود تھی۔ وہ غالباً اپنے مالک کے مہمان سے ناشتے کے بارے میں پوچھے جانے کے بعد ملنے والے احکامات کی منتظر تھی۔ اپنے ناشتے کو ایشو بنانے اور کسی لمبی چوڑی بحث میں الجھنے سے بہتر اسے یہی لگا کہ وہ ایک اچھے مہمان کی طرح میزبان کو تنگ کیے بغیر ناشتہ کر لے۔

"میں رول لوں گی۔" اسے وہاں موجود چیزوں میں رول ہی سب سے ہلکی پھلکی ڈش لگی تھی۔ حیدر نے رول کی پلیٹ اس کی طرف بڑھا دی۔ جبکہ مکھن اس نے خود اپنے قریب کر لیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ رول پر مکھن لگا رہی تھی اور وہ خود آملیٹ کھانے میں مشغول ہو چکا تھا۔ پروین کی ماں بھی واپس کچن میں چلی گئی تھی۔

"بی بی تمہاری وجہ سے جلدی اٹھ گئی تھیں۔ پھر یہ دیکھ کر کہ تم ابھی سو رہی ہو، وہ میرے کہنے پر دوبارہ سونے چلی گئیں۔ میرا خیال تھا کہ تم کافی دیر تک سوؤ گی۔" کیتلی اپنے سامنے کر کے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے وہ اسے بی بی کی غیر موجودگی کے بارے میں بتانے لگا۔

"وہ اصل میں تین ساڑھے تین بجے اٹھ جاتی ہیں۔ پھر فجر کے وقت تک ان کی عبادت چلتی ہے۔ ان کا معمول اسی طرح کا ہے۔ فجر کے بعد پھر وہ سو جاتی ہیں اور پھر دس ساڑھے دس بجے سے پہلے نہیں اٹھتیں۔ ان کا ناشتہ بھی پھر اسی وقت ہوتا ہے۔" اسے چائے دینے کے بعد اب وہ کیتلی میں سے اپنے لیے چائے نکال رہا تھا۔

"بی بی تو سو رہی ہیں۔ میرے آفس جانے کے بعد تم کیا کرو گی؟" کچھ دیر چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر اسے مخاطب کیا۔ اسے خود نہیں پتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے؟ وہ بغیر کوئی جواب دیے احمقوں کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تمہیں کتابیں پڑھنے کا شوق ہے؟" اس کی طرف دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے اس نے پوچھا تو اس نے بغیر سوچے سمجھے فوراً گردن ہلا دی۔ کتابیں پڑھنے کا اسے واقعی شوق تھا۔ ایمن کا خیال تھا کہ وہ اسے پڑھنے کے لیے دو چار کتابیں دے جائے گا۔ لیکن ناشتہ ختم کر کے میز پر سے اٹھتے ہوئے وہ اس سے بولا۔

"آ جاؤ، ناشتہ تو تم پہلے ہی کافی زیادہ کر چکی ہو۔" وہ اس کے آدھا رول کھانے پر کچھ طنزیہ انداز میں بولا۔ وہ خاموشی سے کرسی پر سے اٹھ گئی اور وہ اسے اسٹڈی روم میں لے آیا۔

اتنی بے تحاشا کتابیں! اس کی اسٹڈی تو ام ایمن کی کالج کی لائبریری کو مات کر رہی تھی۔ وہ اپنی حیرت چھپانے میں ناکام رہی تھی۔ ابھی تک اس عالیشان مکان کی کسی قیمتی چیز کو دیکھ کر اس نے اپنے چہرے پر ایسے تاثرات نہیں آنے دیے تھے کہ وہ یہ چیز زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہے لیکن اس کتابوں سے بھری ہوئی اسٹڈی کو دیکھ کر وہ اپنے تاثرات چھپا نہیں پائی۔

اس وسیع و عریض ہال نما کمرے کے بیچوں بیچ دو میزیں آمنے سامنے کچھ فاصلے پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں میزوں کے گرد بہت ساری کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کونے میں ایک الگ تھلگ سی میز پر کمپیوٹر اور اس سے جڑے

دیگر تمام لوازمات رکھے ہوئے تھے۔ وہ رشک اور حیرت سے اس اسٹڈی کو دیکھ رہی تھی۔ ایک نظر میں تو ا
یہی لگا تھا کہ یہاں دنیا زمانے کے ہر موضوع پر کتابیں موجود ہیں۔

"مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تمہیں مطالعہ کا بہت زیادہ شوق ہے۔" وہ اس کے تاثرات انجوائے کرتے ہو
بولا۔ اس نے جواباً نہ تائید میں کچھ کہا تھا اور نہ تردید میں۔

"چلو، پھر تم بور نہیں ہو گی۔ جب تک بی بی نہیں اٹھ جاتیں تم کتابیں پڑھو۔ اگر دل چاہے تو نیٹ سرفنگ
کر لینا۔" اس نے کمپیوٹر کی ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گویا اسے اس بات کی اجازت دی تھی کہ وہ
کتابیں بھی پڑھ سکتی ہے اور کمپیوٹر بھی استعمال کر سکتی ہے۔ وہ اسے خدا حافظ کہتا ہوا اسٹڈی سے باہر چلا گیا۔
کچھ دیر تک گھوم پھر کر چاروں طرف نظر آتی کتابوں کی طرف دیکھتی رہی لیکن وہ نہ کسی کتاب کا نام پڑھ رہی
نہ ہی کوئی کتاب اس نے ہاتھ میں لی تھی۔ وہ بس یونہی وقت گزار رہی تھی۔

دس پندرہ منٹ بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ حیدر آفس جا چکا ہو گا تو وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اندر آ
ہی اس نے الماری کھول کر اپنے کپڑے نکالے۔ کچھ دیر پہلے وہ حیدر مسعود کے سامنے جس طرح شرمندگی مح
کر چکی تھی، اب اسی شرمندگی سے بی بی کے سامنے نہیں گزرنا چاہتی تھی۔ اس کا تیار ہونے کا، کپڑے بد
بال بنانے کا دل چاہ رہا تھا یا نہیں اس بات کو ذہن سے نکال کر اسے اپنا حلیہ درست کرنا تھا۔ بہت زیادہ قیمتی
شاندار ملبوسات اس کے پاس نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے پاس موجود کپڑوں ہی میں سے کوئی بہتر لبا
زیب تن کر ہی سکتی تھی۔ اس نے اپنی ریڈ کلر کی کاٹن کی قمیص نکالی اس پر سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے ڈ
تھے۔ ساتھ کاٹن کا سفید رنگ کا کلف لگا دوپٹہ اور شلوار۔ وہ کپڑے ہاتھ میں لیے باتھ روم میں گھس گئی۔
یہاں اس طرح رہنا ہے کہ اس کے میزبان اس کے مہمان ہونے پر کوفت محسوس نہ کریں۔ وہ اپنے حلیے
توفیق کمال کی بیٹی لگے۔ یہ اس کی خواہش نہیں تھی، لیکن یہ اس کے باپ کی عزت کا سوال تھا اور جب وہ باپ
پاس کراچی آ گئی تھی تو پھر اسے اس کی عزت کا خیال بھی رکھنا تھا۔ توفیق کمال نے اس کی ماں کو اسی لیے چھ
تھا کیونکہ وہ اس جیسے شاندار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد کے ساتھ جچتی نہیں تھی۔ اسے سوسائٹی میں موو کرنا نہیں آ
اسے اچھی گفتگو کرنی نہیں آتی تھی، اسے اچھی طرح تیار ہونا اور پہننا اوڑھنا نہیں آتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ
طرح اس کے باپ نے اس کی ماں کو اس کی جہالت، کم علمی اور مینرز سے ناواقفیت کی بنا پر رد کر دیا تھا ای
اسے بھی کر دے۔ وہ رد ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ اسے توفیق کمال سے محبت تھی بلکہ صرف اس
اس شخص کے علاوہ اب اس کے پاس زندگی میں کوئی جائے پناہ نہیں رہی تھی۔ آج صرف ایک دن کے اند
اس نے حقیقت پسندی سے ساری صورت حال کا جائزہ لے ڈالا تھا اور حقیقت چاہے جتنی بھی تلخ تھی لیک
حقیقت تھی اور ام ایمن کو اسے قبول کرنا تھا۔ وہ امپورٹڈ شیمپو اس کی آنکھوں میں چلا گیا تھا، اسی لیے ا
آنکھوں سے اتنی روانی سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ورنہ رونے والی ایسی کوئی بات تھی تو نہیں۔ نہانے کے بعد
نے اچھی طرح خود پر باڈی اسپرے کیا، ٹیلکم پاؤڈر استعمال کیا۔ اپنے اچھی طرح شیمپو ہوئے بالوں میں

دیر تک برش کیا۔ دوپٹا شانوں پر ڈال کر اس نے خود کو قد آدم آئینے میں دیکھا۔

”کیا اب وہ توفیق کمال کی بیٹی لگ رہی ہے؟“ اس نے خود سے سوال پوچھا۔ اسے بڑا مایوس کن جواب حاصل ہوا۔ وہ اب بھی توفیق کمال کی بیٹی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اس کی طرح خوب صورت نہیں تھی۔ وہ اپنی ماں جیسی تھی۔ بالکل عام سی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے دل میں یہ خواہش ابھری تھی کہ کاش وہ اپنے باپ جیسی حسین ہوتی۔

اس کی ماں نے ایک بار اسے بتایا تھا کہ توفیق کمال کو خوب صورتی اور ذہانت متاثر کرتی ہے۔ وہ خود بھی خوب صورت اور ذہین ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے گرد موجود سب لوگ اس کی طرح خوب صورت اور ذہین ہوں۔ وہ اپنے معیار سے کم تر چیزوں پر سمجھوتا کر لینے والوں میں سے نہیں تھا اور ام ایمن اس کے معیار پر کیونکر پوری اتر سکتی تھی۔ وہ نہ خوب صورت تھی نہ ذہین۔ وہ باپ کو اپنی کس خوبی سے متاثر کرے گی۔ کاش وہ اپنی ماں کے بجائے باپ کے نقوش چرا لیتی۔

اس کی آنکھوں میں شاید ابھی تک شیمپو چلے جانے کی وجہ سے جلن ہو رہی تھی' اسی وجہ سے ابھی تک اس کی آنکھوں سے پانی نکل رہا تھا۔ بجائے دوپٹے سے اپنی آنکھیں صاف کرنے کے اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھے ٹشو پیپر باکس میں سے ایک ٹشو پیپر نکالا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ مینرز سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے دوپٹہ کے بجائے ٹشو پیپر سے منہ صاف کرنا چاہیے اور وہ بھی بڑی نزاکت اور احتیاط کے ساتھ وہ ٹشو پیپر ڈسٹ بن میں ڈال کر کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ اس کا رخ ایک دفعہ پھر اسٹڈی کی طرف تھا۔

چند دن پہلے تک اس کی زندگی میں فرصت نام کی کسی چیز کا دور دور تک گزر نہیں تھا۔ گھر' اسکول' ٹیوشنز' ڈاکٹرز' دوائیں' اس کی زندگی چوبیس گھنٹے ان ہی چیزوں کے پیچھے بھاگتے گزرا کرتی تھی۔ اسے مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ بی اے کے پہلے سال تک جب امی بیمار نہیں تھیں' وہ اپنے اس شوق کو کسی نہ کسی طرح پورا کر لیا کرتی تھی۔ پھر جب امی بیمار پڑیں اور گھر کا سارا بوجھ مکمل طور پر اس کے کندھوں پر آ پڑا تو وہ اپنے اس شوق کو بالکل ہی بھول گئی۔ آج کتنے عرصہ بعد اسے فرصت سے بیٹھ کر کچھ پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ آج اسے اس کی پسند کا ماحول میسر تھا۔ یہاں ڈھیر ساری کتابیں تھیں' سکون تھا' خاموشی تھی' وہ جتنا مرضی پڑھ سکتی تھی لیکن اسے کیا پتا تھا کہ سکون سے بیٹھ کر کتاب پڑھنے والی اس کی یہ خواہش اتنے تکلیف دہ انداز میں پوری ہونے والی ہے۔

بی بی کو اسٹڈی میں آتا دیکھ کر اس نے کتاب بند کر دی اور جلدی سے اٹھ کر انہیں سلام کیا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ کل والی ابتر حالت کے مقابلے میں اس وقت وہ خاصی بہتر لگ رہی تھی۔ اس وقت انہیں اس کے چہرے پر وحشت بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

”مجھے جمیلہ نے بتایا کہ تم اسٹڈی میں ہو۔ میں نے سوچا تمہاری طبیعت کے بارے میں پوچھ لوں۔ رات تو بغیر کھانا کھائے ہی سو گئی تھیں' اب بتاؤ کچھ بہتر محسوس کر رہی ہو۔“ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ قصداً تھوڑا سا مسکرائی۔

”کیا پڑھ رہی تھیں؟“ اس کے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔ اس نے جواباً کتاب کا نام بتا دیا۔ اسی وقت پروین ہاتھ میں ٹرے لیے اسٹڈی میں آئی تھی۔

”میں نے اپنا ناشتہ یہیں منگوا لیا۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا۔ پروین نے ٹرے میز پر ان سامنے رکھی تو انہوں نے اسے بھی اپنے ساتھ ناشتے کی دعوت دی۔

”میں ناشتہ کر چکی ہوں۔“ وہ ابھی تک یہ طے نہیں کر پائی تھی کہ انہیں کیا کہہ کر مخاطب کرے۔ اس کے مختصر جملے میں بہت زیادہ تکلف' اجنبیت اور غیریت شامل تھی۔

وہ ناشتہ کرتے ہوئے اس سے اسی کتاب کے بارے میں باتیں کرنے لگی تھیں جو اس وقت اس کے ہات میں تھی۔ ان کی گفتگو سے وہ ان کی علمی قابلیت کا اندازہ لگا سکتی تھی۔ انہوں نے انگوری رنگ کا کڑھا ہوا سو پہن رکھا تھا۔ ساتھ نفیس سی جیولری۔ یہ جیولری شاید وہ گھر میں مستقل پہنے رہا کرتی تھیں کیونکہ کل بھی اس نے کے کانوں میں یہی ٹاپس' گلے میں یہی چین اور ہاتھوں میں یہی کنگن دیکھے تھے۔ انہوں نے دولت کی نمائش لیے بے تحاشا جیولری نہیں لاد دی تھی۔ وہ لگ بھگ ساٹھ سال کی ہوں گی اور ان کے نقوش یہ بات بتا رہے تھے وہ جوانی میں بہت خوب صورت ہوں گی۔ وہ ان کی سوبر سی تیاری کو ستائشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ان کی گ سن رہی تھی۔ وہ اسے بولنے پر نہیں اکسا رہی تھیں' بس خود ہی بول رہی تھیں۔

اس کے تاثرات سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ان باتوں سے بور نہیں ہو رہی' اس لیے وہ بڑی فرص سے بولنے میں مصروف تھیں۔ ان کی باتیں سنتے سنتے ہی دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ پروین نے کھانا جانے کی اطلاع دی تو وہ اسے ساتھ لیے ڈائننگ روم میں آ گئیں۔

”میں لنچ نہیں کرتی۔ ناشتہ ہی میرا اتنی دیر سے ہوتا ہے کہ پھر دوپہر میں کچھ کھانے کی خواہش نہیں ہ لیکن آج تمہاری وجہ سے میں تھوڑا سا اپنا روٹین چینج کر رہی ہوں۔“ اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھتے ہو انہوں نے پرشفقت انداز میں کہا۔ انہوں نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سلاد لیا جب کہ اسے وہ بالکل کل کی طر اصرار کر کے مختلف ڈشز پیش کر رہی تھیں۔

وہ ان کے خلوص اور محبت سے متاثر ہونے ہی لگی تھی کہ اچانک اسے یہ بات یاد آ گئی کہ اس کے ساتھ محبت بھرا سلوک اس وجہ سے ہو رہا ہے کیونکہ وہ توفیق کمال کی بیٹی ہے۔ اس کے ان کے گھر قیام کا حوالہ یہی کہ توفیق کمال اس کا باپ ہے۔ صرف ام ایمن کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔

حیدر مسعود کا کل رات اور آج صبح کا اپنائیت بھرا دوستانہ انداز اور بی بی کا محبت اور خلوص سے بھرا ہوا اور و اعزازی سلوک توفیق کمال کی بیٹی کے ساتھ ہے۔ زینب توفیق کی بیٹی کے ساتھ نہیں۔ ام ایمن کے ساتھ نہیں۔ اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں۔ وہ یہاں صرف باپ کے نام کی وجہ سے عزت اور اہمیت پا رہی ہے۔

کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں نماز پڑھنے کے لیے جانے لگیں تو وہ بھی اپنے کمرے میں جانے لیے اٹھ گئی۔ نماز کے بعد انہیں اپنے کسی جاننے والے کے گھر ملنے جانا تھا انہوں نے اس سے بھی اخلاقاً سا چلنے کو کہا تو اس نے بڑی شائستگی کے ساتھ معذرت کر لی۔

انہوں نے زیادہ زور بھی نہیں دیا۔ ان جیسی قابل اور ذہین خاتون یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتی تھیں کہ ابھی وہ جس صدمے سے گزر رہی ہے اس میں وہ لوگوں سے میل جول اور کہیں آنے جانے کے بالکل قابل نہیں ہے۔ کمرے میں آ کر نماز پڑھنے کے بعد وہ لیٹی تو جانے کب نیند آ گئی۔ عصر کے وقت اٹھی۔ اب کی بار اس نے صبح والی غلطی نہیں دہرائی۔ وہ کمرے سے اپنے حلیہ درست کر کے باہر نکلی۔

جمیلہ نے اسے لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر فوراً ہی آ کر چائے کا پوچھا۔ اس کے انکار پر اس نے چائے کے متبادل کے طور پر دو تین مشروبات کے نام لیے لیکن جب اس نے ان سب کے لیے انکار کر دیا تو وہ خاموشی سے واپس چلی گئی۔ اس نے صوفے کے پاس سائیڈ میں رکھی میز پر سے ایک میگزین اٹھا لیا۔

"مجھے تمہاری فکر ہو رہی تھی۔ تم اکیلے بور تو نہیں ہو گئیں۔"

"میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سو کر اٹھی ہوں۔" اس نے میگزین بند کر کے واپس رکھتے ہوئے کہا۔

"چائے پی لی تم نے؟" انہوں نے مزید دریافت کیا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر بعد وہ لان میں بیٹھ کر ان کے ساتھ چائے پی رہی تھی۔ دھوپ کب کی ڈھل چکی تھی۔ وہ چائے پیتے ہوئے ان کے لان کی خوب صورتی کو دیکھ رہی تھی۔ یہاں سے بیٹھ کر وہ لان کے آخری سرے پر بنے سوئمنگ پول کو بھی دیکھ رہی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ رات میں وہ کس دروازے سے باہر نکلی تھی جو سیدھی سوئمنگ پول کے پاس والی جگہ پر پہنچی تھی۔ بی بی اس وقت علمی گفتگو کے بجائے ہلکی پھلکی باتیں کر رہی تھیں۔ مغرب کے وقت تک وہ اسے یونہی کمپنی دیتی رہی تھیں۔ مغرب کی اذان ہونے پر وہ دونوں اٹھ کر اندر آ گئیں۔

بی بی نماز کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں اور وہ خود بھی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس کا دل اس جگہ اور اس ماحول کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک وہیں تھا' اسی گھر میں۔ دیر تک جائے نماز پر بیٹھی روتی رہی تھی پھر اسے کچھ خیال آیا۔ یہ رونے کے لیے ہرگز کوئی مناسب وقت نہیں تھا۔ وہ گھبرا کر کمرے سے باہر آ گئی۔

اس نے لاؤنج میں قدم رکھا تو وہاں صوفے پر حیدر بیٹھا نظر آیا۔ وہ بڑے بے فکرے سے انداز میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ایک پل کے لیے جھجک سی گئی۔

"ہیلو' کیا حال ہیں اچھی لڑکی۔" اس نے فوراً ہی اسے دیکھ لیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ ابھی تک وہیں رکی ہوئی تھی۔

"آؤ بیٹھو۔" اس کے کہنے پر وہ آہستہ سے چلتی ہوئی آ کر سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کون سا پروگرام دیکھو گی؟ ایسا کرو' تم اپنی مرضی کا چینل لگا لو۔" اس نے ریموٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"جو آپ دیکھ رہے ہیں' وہی ٹھیک ہے۔" وہ بہت پر تکلف سے انداز میں اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ وہ جواباً کھل کر ہنسا۔

"تم نے ابھی تک ٹی وی کی طرف دیکھا نہیں ہے۔ میں تو بزنس نیوز دیکھ رہا تھا۔ پاکستان کے علاوہ دیگر ایشیائی ملکوں کے اسٹاک ایکسچینج کی کیا صورتِ حال رہی۔ دیکھو گی بزنس نیوز؟" اس کی بات سن کر نہ جانتے

ہوئے بھی بے ساختہ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ صرف۔ ایک پل کے لیے۔ وہ اپنے مسکرا
خود حیران ہوئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ خود کو بمشکل رونے سے روکتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی تھی
صرف چند منٹوں بعد وہ بجائے رونے کے مسکرا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک پل کے لیے ابھرنے والی
مسکراہٹ کو اس نے بغور دیکھا جب کہ وہ خود سنجیدہ نگاہوں سے ٹی وی کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ وہ خود بھی ٹ
کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ابھی ان دونوں کے درمیان مزید کوئی دوسری بات ہوئی نہیں تھی کہ فون کی بیل بجنے لگی۔ حیدر نے ٹی و
آواز ذرا کم کرتے ہوئے اٹھ کر فون اٹینڈ کیا۔

"پہنچ گئے آپ لوگ خیریت سے۔ ہاں میں یہی سوچ رہا تھا کہ آپ کا فون نہیں آیا۔" سلام دعا کے فو
اس نے یہ بات کہی تھی اور وہ فوراً ہی سمجھ گئی تھی کہ دوسری طرف کون ہے۔

"سائرہ ٹھیک ہے؟ اسے کہیے گا حیدر کہہ رہا ہے کہ سائرہ توفیق! اب آپ ذرا بڑا ہونے کی کوشش کیجیے۔
مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر اس کے بعد وہ خاموشی سے ان کی بات سننے لگا۔

"ہاں ایمن بالکل ٹھیک ہے۔ اس وقت میرے ساتھ بیٹھ کر بزنس نیوز دیکھ رہی ہے۔" اس نے ہنستے ہ
ان سے کہا اور پھر ایک مسکراتی ہوئی نظر اس پر بھی ڈالی۔

"توفیق بھائی تم سے بات کریں گے۔" ان کی بات سننے کے بعد اس نے ریسیور کان سے ہٹاتے ہو
اس سے کہا۔ وہ کچھ حیرت زدہ سی اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگ
ہوئے اس نے انہیں سلام کیا۔ اس کی آواز میں نہ نفرت تھی نہ غصہ صرف اور صرف اجنبیت تھی۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو تم؟" ان کی بھاری مردانہ آواز کسی بھی قسم کے جوش اور محبت سے عاری تھی۔ ا
کم از کم ایسا ہی لگا تھا کہ ایک غیر آدمی اس کی خیریت پوچھ رہا ہے۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اسے رونا نہیں آ رہا تھا۔ وہ بس اس بات کی کوشش کر رہی تھی کہ کوئی ایسی بات اس
منہ سے نہ نکلے جو اس جیسے ذہین اور قابل آدمی کو ناگوار گزرے۔

"کوئی پریشانی تو نہیں ہے تمہیں؟ کچھ چاہیے تو نہیں ہے؟" اس کا باپ ایک بزنس مین تھا اور وہ اس
اسی طرح کی بات کر سکتا تھا۔

"نہیں۔" اس نے جواباً لمبا فقرہ بولنے کا رسک نہیں لیا۔

"کچھ چاہیے ہو تو حیدر سے کہہ دینا۔ اچھا یہ الماس تم سے بات کرے گی۔" انہوں نے اپنی بات مکمل ک
ہوئے اس سے اس کی مرضی پوچھے بغیر ریسیور اس عورت کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ یہ نہیں پوچھا کہ تم الماس
بات کرنا چاہتی ہو یا نہیں۔

وہ اب دوسری طرف اس عورت کی آواز سن رہی تھی جس سے اسے شدید نفرت تھی۔

"کیسی ہو ایمن؟" اس نے الماس توفیق کو سلام نہیں کیا تھا۔ وہ سرے سے کچھ بولی ہی نہیں تھی۔ اس

کہہ کر انہوں نے خود ہی اس کی خیریت پوچھی۔ اس نے بڑی مشکلوں سے خود کو جواب دینے پر آمادہ کیا۔

”ٹھیک ہوں۔“ زندگی میں یہ وقت بھی آنا تھا۔ اسے اس عورت سے بات کرنی پڑ رہی تھی جس نے اس کی ماں سے اس کی سب خوشیاں چھین لی تھیں۔

وہ اتنی کمزور تھی کہ اس عورت سے کھل کر نفرت کا اظہار تک نہیں کر سکتی تھی۔

”تمہاری امی کے لیے بہت افسوس ہوا ایمن! ہمارا امریکہ جانا اتنا ضروری نہ ہوتا تو ہم لوگ ضرور رک جاتے۔“ وہ خون کے گھونٹ پیتے ہوئے یہ تعزیتی جملے سن رہی تھی۔

اگر وہ توفیق کمال کے پاس رہنے کی محتاج نہ ہوتی، اگر وہ اس کے نام کا سہارا لیے بغیر جینے کے قابل ہوتی تو اس عورت کو اتنی گالیاں دیتی، اتنا کچھ کہتی جتنا کہ اس نے زندگی میں کبھی کسی کو نہ کہا ہوتا۔

”ویسے بی بی اور حیدر کے پاس تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ہم لوگ بھی کوشش کر رہے ہیں کہ اپنا قیام مختصر کر کے جلدی کراچی واپس آ جائیں۔“ یہ ساری باتیں یقیناً رسماً کی جا رہی تھیں ورنہ الماس توفیق کو ام ایمن سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ شاید اخلاقاً، دنیا دکھاوے کے لیے، شوہر کے دل میں اپنی قدر و منزلت بڑھانے کے لیے۔

وہ ان کی اتنی ساری باتوں کے جواب میں صرف جی بولی تھی۔

”اچھا یہ لو، توفیق سے بات کرو۔“ انہوں نے ریسیور دوبارہ توفیق کمال کو دے دیا۔

”حیدر کہاں ہے؟ میری اس سے بات کرا دو۔“ انہوں نے ریسیور ہاتھ میں لیتے ہی اس سے کہا۔ اسے خود بھی اتنی دیر میں پہلی مرتبہ حیدر کا خیال آیا تھا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو وہ صوفے پر نہیں تھا۔ اس نے لاؤنج میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ اسے اس کے باپ کے ساتھ گفتگو کرتا چھوڑ کر شاید ریسیور اس کے ہاتھ میں دیتے ہی لاؤنج سے چلا گیا۔

”وہ یہاں نہیں ہیں۔ آپ ہولڈ۔“ اس کا آہستہ آواز میں دیا جانے والا یہ جواب انہوں نے درمیان ہی میں کاٹ دیا۔

”کوئی بات نہیں۔ میں اس سے آفس میں بات کر لوں گا۔ خدا حافظ“

حیدر سے پھر اس کی ملاقات کھانے کی میز پر ہوئی۔ وہ ریسیور اسے دے کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا یا کہیں اور لیکن بہرحال وہ اس کے بعد اسے اب نظر آیا تھا۔

وہ اور بی بی پہلے ہی ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھیں، حیدر ملازم کے بلانے پر ابھی ابھی آیا تھا۔ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک نظر ایمن پر ڈالی۔ وہ سر جھکائے اپنی پلیٹ کو گھور رہی تھی۔

”شروع کرو بیٹا۔“ بی بی نے حسب عادت اس کی کھانے کی میز پر دل و جان سے میزبانی شروع کر دی۔

اس نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سالن ڈال لیا۔

”آج مگل یاز کا فون آیا تھا۔ دو چار معمولی نوعیت کے مسائل ہیں۔ میرا خیال ہے، میں خود ہی زمینوں کا چکر لگا آؤں۔“ حیدر اور بی بی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

بی بی اس کے مسائل کی نوعیت جاننا چاہ رہی تھیں، لیکن وہ بجائے ان مسائل کو ان کے ساتھ ڈسکس کرنے

کے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ ایمن نے پلیٹ میں ڈالے تھوڑے سے سالن کو آہستہ آہستہ اس طرح ختم ک کہ وہ کھانے کے اختتام تک ان لوگوں کا ساتھ دے سکے۔ بی بی کھانا کھا چکی تھیں، ان کے بعد اس نے اپنی پلیٹ میں موجود سالن ختم کیا تھا۔

وہ پانی پینا چاہتی تھی اور پانی پینے ہی کے لیے اس نے اپنا اتنی دیر سے پلیٹ پر جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔ س اٹھاتے ہی اس کی نگاہ حیدر پر پڑی۔ وہ بی بی کی کسی بات کا جواب دے رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں اس پر تھیں۔ اس کے دیکھ لینے پر بھی اس نے اپنی نگاہیں نہیں ہٹائی تھیں۔ اسے اس شخص کی ان ذہین آنکھوں سے بہت ڈر لگ تھا۔ وہ اس وقت اس کے چہرے پر کیا پڑھ رہا ہے؟ وہ نہیں چاہتی تھی کہ حیدر مسعود اس بات سے آگاہ ہو کہ و اپنے باپ سے بات کرنے کے بعد شدید مایوسی اور ڈپریشن کا شکار ہے۔ اسے اپنے باپ سے بھی کوئی توقعات وابستہ نہیں رہیں پھر بھی اس وقت وہ بہت اپ سیٹ تھی۔

وہ کل رات کی طرح دوبارہ کبھی اس شخص کے سامنے اپنی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حیدر نے پا کا جگ اور گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ کھانے کے بعد حیدر اور بی بی کا لاؤنج میں بیٹھ کر چائے پینے کا پروگرا تھا۔ وہ چائے کے لیے منع کر کے بڑی شائستگی سے ان دونوں سے معذرت کرتی اپنے کمرے میں آ گئی۔

وہ تکیہ میں منہ چھپائے بے آواز رو رہی تھی۔ وہ زندگی میں ہر طرح تنہا ہو چکی ہے۔ اس کا کوئی بھی نہیں۔ کس کو بھی اس کی پروا نہیں۔ کسی کو بھی اس سے محبت نہیں۔ دروازے پر دستک سن کر وہ یک دم اٹھ بیٹھی۔

جلدی جلدی اپنا چہرہ صاف کر کے دوپٹہ اوڑھتے ہوئے اس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ سامنے کھڑے حیدر مسعود کو دیکھ کر وہ بے حد حیران ہوئی۔ وہ بی بی یا پروین کو سامنے دیکھنے کی توقع کر رہی تھی، حیدر کے بارے میں تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

”میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ سنجیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ وہ نف میں سر ہلاتی سامنے سے ہٹتے ہوئے اسے اندر کے لیے راستہ دینے لگی لیکن وہ اندر نہیں آیا تھا۔

”میں تمہیں یہ پیسے دینے آیا تھا۔“ اس کے ہاتھ میں بہت سے نوٹ تھے جو وہ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ اس نے وہ پیسے لینے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔

”آپ کا بہت شکریہ۔ مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔“ زندگی میں اور کوئی فخر اس کے پاس تھا یا نہیں ک از کم یہ فخر تو حاصل تھا کہ اس کی ماں نے اسے اپنے بل بوتے پر خود محنت کر کے بغیر کسی کی مدد لیے پالا تھا۔

”لے لو۔ یہ میرے پیسے نہیں ہیں۔ تمہارے پاپا کے ہیں۔ ابھی فون پر انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ایمن کو کچھ پیسے وغیرہ دے دینا۔ اب کتنے دینا یہ انہوں نے مجھے نہیں بتایا۔ میں اپنی مرضی سے لے آیا ہوں۔ تم ان پیسوں کو بے تکلف استعمال کر سکتی ہو بلکہ اگر اور چاہیے ہوں تو بھی مجھے بتا دینا۔ ابھی تو یہ پیسے میں اپنے ہی پاس سے لا ہوں لیکن بے فکر رہو، اتنا سخی نہیں ہوں، توفیق بھائی کے واپس آتے ہی سارے پیسے ان سے لے لوں گا۔“ اس نے ابھی بھی پیسے لینے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔

”میں جھوٹ نہیں بول رہا ام ایمن! تم کہو تو میں تمہاری بوسٹن توفیق بھائی سے بات کرا دوں۔ انہوں نے

مجھ سے یہی کہا تھا کہ ایمن کو شاید پیسوں کی ضرورت ہو' اسے پیسے دے دینا۔ ان پیسوں پر تمہارا حق ہے۔ یہ تمہارے پاپا کے پیسے ہیں۔" وہ اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس کا اپنے باپ کی بھی کسی چیز پر کوئی حق نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے خاموشی سے وہ نوٹ ہاتھ میں لے لیے۔ وہ کچھ طمانیت بھرے انداز میں مسکرایا تھا۔

''میں کل جیکب آباد جا رہا ہوں۔ تین چار دن میں واپس آؤں گا۔ بی بی تو ہیں یہاں تمہارے پاس۔ میں نے بی بی سے کہا ہے کہ میرے پیچھے ام ایمن کو بور مت ہونے دیجیے گا۔ چاہو تو کل ان کے ساتھ شاپنگ پہ چلی جانا۔ اس طرح تمہاری کراچی کی بھی تھوڑی بہت سیر ہو جائے گی۔" وہ جیسے مکمل طور پر اس کی ذمہ داری تھی اور وہ اپنی ذمہ داری نبھانے کے لیے دل و جان سے تیار۔ وہ اسے اپنے گھر میں لایا تھا تو لانے کے بعد سے ایک پل کے لیے بھی اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے شب بخیر کہتا وہاں سے چلا گیا اور وہ دروازہ بند کر کے دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

پچیس ہزار روپے۔ ان نوٹوں کو گننے کے بعد وہ تمسخرانہ انداز میں خود پر ہنسی۔ چند ہی دنوں میں ام ایمن کی زندگی میں کیا تغیر آیا تھا۔ وہ اسکول میں پچیس سو روپے کمانے والی ام ایمن جس نے تین مہینے پہلے بڑی کوششوں کے بعد اپنی تنخواہ پچیس سو سے بڑھوا کر ستائیس سو روپے کروائی تھی' آج اسے یونہی شاپنگ اور سیر و تفریح کے لیے پچیس ہزار روپے دیے جا رہے تھے۔ اس نے وہ نوٹ یونہی دراز میں ڈال دیے تھے۔

* * *

بی بی نے اگلے روز دوپہر کے کھانے کے بعد اس سے شاپنگ پر چلنے کی بات کی۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ اسے زبردستی ساتھ نہیں لے جا سکتی تھیں۔ اس کے انکار پر انہوں نے بات وہیں ختم کر دی۔ بی بی ہی سے اسے پتا چلا کہ حیدر صبح آفس چلا گیا تھا' وہیں سے غالباً لنچ کے بعد اسے جیکب آباد چلے جانا تھا۔ شام میں بی بی کے کچھ مہمان آ گئے تو وہ تھوڑی دیر لان میں گھوم پھر کر لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔

رات کے کھانے کے بعد فوراً سونے کے لیے چلے جانے کے بجائے وہ بی بی کے ساتھ لاؤنج میں ہی بیٹھی رہی۔ اس کے ساتھ چائے پی کر کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ کمرے میں جانے کے لیے اٹھ گئی تھیں۔

اگلی صبح بی بی اپنے معمول کے مطابق دس بجے اٹھی تھیں۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔

''رات حیدر کا فون آیا تھا۔ تمہاری خیریت پوچھ رہا تھا۔" اس کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہوئے انہوں نے اسے بتایا۔ وہ ناشتے کے طور پر ایک کپ چائے پی کر بی بی کے جاگنے سے بہت پہلے ہی فارغ ہو چکی تھی۔

''پوچھ رہا تھا' آپ ایمن کو لے کر کہاں گئیں۔ شاپنگ کرانے یا کہیں گھومنے پھرنے۔" چائے پیتے ہوئے انہوں نے اسے مزید بتایا۔

''آج چلو تم میرے ساتھ۔ ابھی پہلے مجھے مسز پرویز کی عیادت کرنے جانا ہے۔ ان کی بیماری کا اتنے دنوں سے سن رکھا ہے اور جا نہیں پائی۔ آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھیں گے پھر اس کے بعد شاپنگ کے لیے چلے جائیں گے۔" انہوں نے غالباً یہ پروگرام پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا۔ وہ ان کے کسی جاننے والے سے مل کر کیا کرتی اور شاپنگ؟ وہ انہیں یہ بات کیسے بتائے کہ اپنے باپ کے دیے پیسے اس کا استعمال کرنے کا دل نہیں چاہ رہا۔ اس

نے ساری زندگی اس شخص کا دیا ایک۔ پیسہ استعمال نہیں کیا پھر اب کیسے؟
''آپ پلیز مجھے ایکسکیوز کر دیں۔ میرا ابھی شاپنگ کا یا کہیں بھی جانے کا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔'' اس
بڑی بے چارگی سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک دم ہی سامنے والے صو
سے اٹھ کر اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گئیں۔
''مجھے پتا ہے بیٹا! ابھی تمہارا کہیں آنے جانے یا سیر و تفریح کا دل نہیں چاہ رہا۔ تم ماں کی جدائی کے ا
بڑے سانحے سے گزری ہو لیکن پھر بھی بیٹا یوں خاموش اور گم صم مت رہا کرو۔ تمہارا دل نہیں چاہ رہا تو کوئی بات
نہیں۔ کل اگر تمہارا موڈ ہوا تو ہم کل چلیں گے۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت او
اپنائیت سے کہا تو وہ اپنے آنسو روک نہیں پائی۔ اسے رونے سے منع کرنے کے بجائے انہوں نے محبت بھر
انداز میں اپنا ہاتھ اس کے کندھے کے گرد رکھ دیا تھا۔

* * *

''سائر بوسٹن میں ماریہ ای کے پاس تو رہ رہا ہے۔'' کھانا کھاتے ہوئے بی بی نے بڑی روانی سے ماریہ نا
کی خاتون کا یوں ذکر کیا گویا وہ انہیں پہلے سے جانتی تھی۔ بات شروع انہوں نے حیدر کے ذکر سے کی تھی۔
''پتا نہیں زمینوں پر کیا مسئلہ ہے۔ شروع کی عادت ہے یہ اس کی اپنی پریشانیاں اور مشکلات کسی کے سا
ڈسکس نہیں کرتا۔ میں ناراض ہوں تو کہتا ہے کہ بی بی آپ ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہیں۔ بس اسی
میں آپ کو نہیں بتاتا۔ آپ پریشان ہونا چھوڑ دیں تو میں آپ کے ساتھ اپنی ساری کاروباری الجھنیں ڈسکس
شروع کر دوں گا۔'' یونہی حیدر کا ذکر کرتے کرتے انہیں یہ ماریہ نامی خاتون یاد آئی تھیں۔ وہ کھانا کھاتے ہو
خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔
جس محبت سے وہ حیدر کا ذکر کر رہی تھیں اب اسی محبت سے کسی ماریہ کا ذکر کر رہی تھیں۔
''ماریہ حیدر کی چھوٹی بہن ہے۔ حیدر سے دو سال چھوٹی ہے۔ میرے لیے تو یہ دونوں ہی بھتیجا اور بھتیجی
بلکہ میری اولاد کی طرح ہیں۔'' اس نے ان سے ان کی کوئی بھی پرسنل بات نہیں پوچھی تھی لیکن آج وہ خود ہی
کے ساتھ اپنے بارے میں بہت سی باتیں کرنے لگی تھیں۔
وہ حیدر کے والد سے بڑی تھیں۔ شادی کے دس سال بعد ان کے شوہر اور بیٹے کا ایک ایکسیڈنٹ میں ا
ہو گیا تھا پھر انہوں نے کبھی دوسری شادی کے بارے میں نہیں سوچا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا محور بھائی' بھ
اور ان کے بچوں کو بنا لیا تھا۔ حیدر کی ممی کے ہوتے ہوئے بھی ان کا اپنے بھتیجے بھتیجی کی تربیت میں خاصا دخل تھ
''حیدر اپنی ماں کا ذرا زیادہ لاڈلا تھا اور ماریہ مجھ سے زیادہ قریب تھی۔ خاندان میں سے ہی رشتہ آیا ا
فاناً ماریہ کی شادی ہو گئی۔ ہمارا تو اتنی جلدی اس کی شادی کرنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ صرف اکیس سال
تھی وہ اس وقت' لیکن مکرم کے گھر والوں کو شادی کی بہت جلدی تھی۔ ماریہ کی شادی کے بعد کتنے دنوں تک
حال ہی برا رہا۔ کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا۔ اب تو ماشاء اللہ اس کے دو بچے ہیں۔ بہت خوش ہے۔"
وہ اپنے غموں میں الجھی ہوئی تھی' اب جو انہوں نے یہ ذکر کیا تو وہ ان کے بارے میں سوچنے اور

ہونے پر مجبور ہوئی وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ ان کے شوہر اور بیٹا ایکسیڈنٹ میں مر گئے تھے۔ کتنا بڑا دکھ ہوگا یہ ان کے لیے مگر وہ اس بات پر کوئی شکوہ یا گلہ کرتی نظر نہیں آ رہی تھیں۔

جب انسان خود دکھ سے گزرتا ہے تو دوسروں کا دکھ بہت اچھی طرح سمجھ لیتا ہے۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ اس بات کا جتنے عام سے انداز میں ذکر کر رہی تھیں، درحقیقت یہ بات ان کے لیے اتنی عام تھی نہیں۔ اس نے بے ساختہ دعا کی کہ وہ بھی ان جیسی ہو جائے۔

”اس کے بچوں کی پڑھائی کا مسئلہ ہوتا ہے اسی لیے ایک ڈیڑھ مہینہ سے زیادہ نہیں رکتی۔ صرف حیدر کی شادی پر ہی ایسا ہوا تھا کہ وہ پورے تین مہینے کراچی میں رہی تھی۔“ ان کی اس بات پر اس نے کچھ حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

حیدر شادی شدہ تھا۔ اسے اس بات پر حیرت ہوئی۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان دنوں میں اس نے نہ تو اس کی بیوی کو دیکھا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی ذکر سنا تھا۔ بلاوجہ کا تجسس ظاہر کیے بغیر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ ہو سکتا ہے اس کی بیوی ملک سے باہر کہیں گئی ہوئی ہو۔ اس نے از خود یہ بات فرض کر لی اور ایک مرتبہ پھر بی بی کی گفتگو کی طرف دھیان دینے لگی۔

کھانے کے بعد بی بی زیادہ دیر نہیں جاگتی تھیں۔ ان چھ دنوں میں وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہو چکی تھی۔ انہیں رات کے آخری پہر عبادت کے لیے اٹھ جانا ہوتا تھا' اسی لیے دس ساڑھے دس بجے سو جایا کرتی تھیں۔ کھانے کے بعد کچھ دیر اس کے ساتھ باتیں کر کے وہ دس بجے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ بجائے اپنے کمرے میں جانے کے اسٹڈی میں آ گئی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کچھ پڑھے۔ تھوڑی دیر کے لیے سب باتوں کو بھول کر وہ کسی اچھی سی کتاب کو انجوائے کرے۔ اسے یہ بھی پتا تھا کہ اس کے موڈ میں یہ اچانک تبدیلی بی بی کی باتیں سن کر آئی ہے۔ اسے پتا تھا وہ ان جیسی صابر اور شاکر نہیں پھر بھی تھوڑی دیر کے لیے وہ زندگی سے اپنے سارے گلے شکوے بھول جانا چاہتی تھی۔ اس وقت گھوم پھر کر کتابیں دیکھتے ہوئے وہ باقاعدہ ان کے نام پڑھ رہی تھی۔ اس نے اپنی مرضی سے باقاعدہ انتخاب کر کے اکنامکس کی ایک کتاب نکالی۔

تھرڈ ایئر میں اس کی اکنامکس کی لیکچرار نے لیکچر دیتے ہوئے ایک مرتبہ اسی مصنف کی کسی کتاب کا حوالہ دیا تھا۔ اس وقت تو وہ کتاب نہ اسے اپنے کالج کی لائبریری میں ملی تھی اور نہ کہیں اور سے دستیاب ہو پائی تھی لیکن آج اسے اسی مصنف کی اسی موضوع پر ایک دوسری کتاب پڑھنے کا موقع مل گیا تھا۔ بڑے مطمئن سے انداز میں کتاب ہاتھ میں لے کر وہ وہیں میز کے آگے سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ صرف لفظوں کو پڑھ نہیں رہی تھی بلکہ انہیں سمجھنے کی بھی کوشش کر رہی تھی۔ اسے یہاں بیٹھ کر کتاب پڑھتے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔

”السلام علیکم۔“ دروازے سے اندر آتے حیدر کو دیکھ کر اس نے فوراً سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ اس نے دور ہی سے اس کے سلام کا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اسٹڈی کی لائٹ آن دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ خاتون یہاں ہیں۔“ وہ چلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ گھر واپس آئے غالباً کافی دیر ہو چکی تھی اس کے لباس اور اس کے انداز سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

”میں نے سوچا کہ ابھی تم جاگی ہوئی ہو تو یہ ابھی تمہیں دے دوں۔ صبح پھر جب میں آفس جاؤں گا ت اس وقت تم سو رہی ہو گی۔“ ایمن نے چونک کر اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا تو اس میں بڑی خوب صور ریپ ہوا ایک ڈبا تھا۔

”جہاں میں گیا تھا وہاں سے تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ تمہارے لیے کیا لے جاؤں' اس لیے آج واپسی پر یہ یہیں سے خریدا گیا ہے۔ میں سات بجے کراچی واپس آ گیا تھا۔ آفس میں ایک دو ضروری کام تھے اس لیے بجائے گھر آنے کے سیدھا آفس چلا گیا بلکہ نہیں سیدھا نہیں گیا تھا' پہلے تمہارے لیے یہ خری کے بعد آفس گیا تھا۔ میں نے سوچا تم کہو گی کہ میں خالی ہاتھ واپس آیا ہوں۔ تمہارے لیے کچھ بھی نہیں اس کے سامنے ڈبا رکھتے ہوئے وہ بڑی بے تکلفی سے بولا۔

وہ ہونق سے انداز میں منہ پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا کب اس کے ساتھ ایسا کوئی رشتہ تھا جو کے لیے تحفے لاتا اور اگر لانا بھول جاتا تو وہ برا مانتی۔ اس بے تکلفانہ انداز کے جواب میں اسے کیا کہنا چا سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

”کوئی تحفہ دے تو اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں پھر دینے والے کی خوشی کی خاطر اس تحفے کو اسی کے س کھول کر دیکھتے ہیں۔ اگر چیز پسند کی ہے تو پھر تو کیا ہی بات ہے اور اگر پسند کی نہیں ہے تو بھی دینے وال رکھنے کی خاطر اس تحفے کی جھوٹی تعریفیں کرتے ہیں۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے اسے مینرز سکھانے کی کوشش کر ر وہ کچھ نروس سی ہو گئی' وہ میز پر اس کے بالکل سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

میز پر دونوں کہنیاں ٹکائے وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ ”اب کھول بھی چکو کب تک اس کا معائنہ کر ایمن نے اس کی طرف دیکھا' اس کے چہرے پر بہت دوستانہ سی اپنائیت بھری مسکراہٹ تھی۔

اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے سامنے رکھے تحفے کو دیکھا' پھر کچھ سوچ کر وہ اسے کھولنے لگی۔ وہ ڈبا سرخ او رنگ کے بڑے خوب صورت سے ریپنگ پیپر میں لپٹا ہوا تھا اور اس پر سرخ رنگ کا ہی ربن بھی بندھا ہوا تھا۔

اسے کھولنے پر اندر سے ایک بہت ہی خوب صورت چاکلیٹ باکس نکلا تھا۔ اس نے وہ باکس کھولا میں بیضوی شکل کی بہت ساری چاکلیٹس گولڈ کلر کے فوائل میں لپٹی ہوئی بڑی خوب صورتی اور نفاست تھیں۔ ابھی اس نے باکس کو کھول کر چاکلیٹس پر ایک نظر ہی ڈالی تھی کہ وہ بولا۔

”اور اگر تحفہ کوئی کھانے کی چیز ہو تو اسے دینے والے ہی کے سامنے تھوڑا سا چکھتے ضرور ہیں۔“ وہ ا مذاق کو سمجھ گئی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے اس کی باتیں بری نہیں لگ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر کی جگہ ہلکی سی مسکراہٹ نے لے لی تھی۔ اس نے ان میں سے ایک چاکلیٹ اٹھا کر اس کا فوائل کھولنے اسے منہ میں ڈال لیا تھا۔

’صرف خود ہی نہیں کھاتے‘ اخلاقاً دینے والے کو بھی پوچھ لیتے ہیں۔“ اب کی بار وہ خود کو ہنسنے سے بالکل نہیں روک پائی۔ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا مذاق اتنی سنجیدگی کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ چاکلیٹ باکس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ایمن نے اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر سنجیدگی کی جگہ بڑی شرارتی سی مسکراہٹ نظر آئی۔

”جب تمہاری ہنسی اتنی خوب صورت ہے تو پھر تم ہنسنے میں اتنی کنجوسی کیوں کرتی ہو؟“ اپنے لیے ایک چاکلیٹ نکالتے ہوئے اس نے اسی شرارتی مسکراہٹ کو چہرے پر سجائے اس سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں‘ اس کے انداز میں‘ اس کی نگاہوں میں سوائے خلوص اور اپنائیت کے دوسرا کوئی رنگ نہیں تھا‘ پھر بھی وہ بری طرح گھبرا گئی۔

چاہے وہ عام سے ہی انداز میں اس کی تعریف کر رہا تھا لیکن اس کے لیے یہ زندگی میں پہلا موقع تھا جب ایک مرد نے اس کی کسی ظاہری خوبی کو سراہا تھا۔ اسے پتا تھا اس وقت اس کے چہرے پر شرم بھی ہے اور گھبراہٹ بھی۔

”کوئی تعریف کرے تو بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ اس نے سر اوپر کر کے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

”جا رہا ہوں میں‘ تم اپنی کتاب انجوائے کرو۔“ وہ ہنستے ہوئے کرسی پر سے اٹھ گیا۔

* * *

”جلدی سے تیار ہو جاؤ‘ میں تمہیں باہر لے کر جا رہا ہوں۔“ آفس سے آتے کے ساتھ ہی بی بی کو سلام کرنے کے بعد اس نے اس سے یہ بات کہی تھی۔ اس کا انداز حکمیہ اور بالکل دوٹوک تھا۔

”میں......لیکن وہ......“ فوری طور پر وہ انکار میں کوئی ڈھنگ کی بات بول بھی نہیں پائی۔

”ہاں‘ میں وہ کیا؟“ اس نے اسے گھور کر دیکھا۔

”میرا کہیں بھی جانے کا موڈ نہیں ہے۔“ ہمت کر کے اس نے دوٹوک انکار کر ہی دیا۔

”میں نے تم سے تمہارے موڈ کے بارے میں پوچھا بھی نہیں ہے۔ تم نے شاید میرے جملے پر غور نہیں کیا۔ میں تم سے تمہاری مرضی نہیں پوچھ رہا ہوں‘ میں تمہیں بتا رہا ہوں۔“ بی بی‘ حیدر کے تحکمانہ انداز اور ایمن کی پریشان شکل کو دیکھ کر ہنس پڑیں۔

”مجھ سے بھی کل رات آتے ہی اس نے یہی پوچھا تھا کہ آپ ایمن کو لے کر کہیں باہر گئیں۔ میرے انکار پر مجھ سے خفا ہوا تھا کہ اگر وہ منع کر رہی تھی تو بھی آپ زبردستی لے جاتیں۔ اتنے دنوں سے وہ مسلسل گھر میں بند ہے۔“ ان کی مخاطب ایمن تھی۔

”ہاں تو میں بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ توفیق بھائی آ کر کیا کہیں گے کہ ہم نے ان کی بیٹی کا ذرا سا بھی خیال نہیں رکھا۔ اسے بالکل بھی وقت نہیں دیا۔ میں بس دس منٹ میں آ رہا ہوں‘ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ پہلے بی بی اور پھر بعد میں اس سے کہتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔

بی بی کے نرمی بھرے انداز میں کیے جانے والے اصرار کو وہ بڑے آرام سے ٹال گئی تھی مگر اس کے حکمیہ اور دوٹوک انداز پر اسے انکار کرنا نہیں آ رہا تھا۔ یہ اس کا ماحول نہیں تھا اس طرح کسی مرد کے ساتھ گھر سے باہر جانے

گا اس کی زندگی میں کبھی کوئی تصور نہیں تھا لیکن وہ یہ بھی جاننے لگی تھی کہ یہ اس کے باپ کا ماحول تھا اور یہ
کے میزبان اس کی اتنی دل جوئی اسی لیے کر رہے تھے کیونکہ وہ توفیق کمال کی بیٹی ہے۔
اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی وہ انتہا سے زیادہ نروس تھی۔ اس کے ساتھ اکیلے کسی جگہ جانے کا تصو
بری طرح بوکھلا رہا تھا۔ وہ اپنی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ پر قابو پانے سے قاصر تھی۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کر ر
اس نے ایک بار بھی اسے مخاطب نہیں کیا۔
ہاں! وہ اس کی تھوڑی تھوڑی دیر بعد خود پر پڑنے والی سرسری سی نظروں کو ضرور محسوس کر رہی تھی۔
اسے پتا تھا کہ اس کا گھبرانا اور نروس ہونا انتہائی احمقانہ تھا۔ وہ اس سے عمر میں اتنا بڑا تھا وہ شادی شدہ
اس سے بات بھی بالکل اسی طرح کرتا تھا جیسے کسی اپنے سے عمر میں چھوٹے فرد کے ساتھ کی جاتی ہے۔
وہ یہ سب سمجھتی تھی پھر بھی گھبرا رہی تھی۔ اس کے برابر گاڑی میں بیٹھی وہ خود اپنا تجزیہ کر رہی تھی۔ اس کا
تبدیل ہوا تھا‘ اس کا گھر تبدیل ہوا تھا تو خود بخود ہی اس کے لیے سوچ کے بھی کئی در وا ہوئے تھے۔ وہ زند
پہلی مرتبہ اپنی بہت سی کمزوریوں اور خامیوں سے آگاہ ہو رہی تھی۔ اپنی جن خامیوں کے بارے میں ا
زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا ان پر وہ اس وقت غور کر رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ جانے سے اس لیے نہیں گھب
تھی کہ وہ ایک مرد تھا۔ وہ اس سے بات کرتے وقت اس لیے نروس نہیں ہوتی تھی کیونکہ وہ ایک مرد ہے۔
گھبرانا اور لوگوں کو فیس نہ کر سکنا یہ سب تو اس کی بچپن کی عادتیں تھیں۔ وہ مردوں سے تو کیا عورتوں سے بھی
کے ساتھ بات نہیں کر سکتی تھی۔
اس کی ماں احساسِ کمتری میں مبتلا تھی۔ شاید شوہر کے رد کر دینے نے اس کے اندر اس احساسِ کمتر
دے دیا تھا اور ماں کا یہی احساسِ کمتری پورا کا پورا اس کے اندر منتقل ہو گیا تھا۔
اس کی اور امی کی زندگی میں زینت خالہ کی فیملی کے علاوہ دوسرا کوئی فرد تھا نہیں۔ اس میں تو اتنی سی بھی
نہیں تھی کہ وہ اس معمولی سے پرائیویٹ اسکول میں اپنے بل بوتے پر جاب حاصل کر لیتی۔ امی کی بیماری
لوگوں کی مالی مشکلات دیکھتے ہوئے اس کے فائنل ایئر کے دوران اسے وہ معمولی سی نوکری بھی عارف بھ
دلوائی تھی۔ چند مہینوں پہلے جو اس کی سیلری بڑھی تھی وہ بھی عارف بھائی ہی کی وجہ سے بڑھی تھی۔ وہ اب تک
رہی تھی کہ وہ ایک چھوٹے شہر سے بڑے شہر میں آئی ہے‘ مڈل کلاس سے اپر کلاس میں داخل ہوئی ہے اس
رہی ہے۔ پھر ابھی وہ ماں کی جدائی کے غم سے بے حال ہے‘ باپ کے متوقع رویوں کی وجہ سے پریشان
اس وقت پہلی دفعہ اسے اندازہ ہوا تھا کہ اصل وجہ یہ نہیں ہے۔ اصل وجہ اس کا ابنارمل ماحول ہے۔ ا
کو کمتر سمجھنا ہے‘ اسے سوشل ہونا آتا ہی نہیں تھا۔ پہلی دفعہ اس کے دل میں ماں کے لیے ایک شکوہ بھی پیدا
”امی! آپ نے مجھے ایک ابنارمل ماحول کیوں دیا۔ آپ نے میری پرورش نارمل بچوں کی طرح کیوں نہیں
اس نے حیدر آباد میں اپنی ہی طرح کے متوسط طبقے کے گھرانوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کو
حاصل کرتے اور اچھی اچھی جابز کرتے دیکھا تھا۔ پیسے کی کمی نے ان سے ان کا اعتماد نہیں چھینا تھا۔ وہ

کے باوجود خود پر بھروسہ کرتی تھیں۔ انہیں اپنی صلاحیتوں پر مکمل بھروسہ تھا اور وہ اپنی کس صلاحیت پر کیا بھروسہ کرتی؟ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آیا اس میں کوئی صلاحیت ہے بھی یا نہیں؟

وہ اسے ایک شاپنگ سینٹر میں لے آیا تھا۔ اپنے بارے میں سوچی تمام باتوں کے باوجود وہ ہنوز بے تحاشا ڈری اور گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ مختلف دکانوں کو دیکھتے ہوئے گزر رہی تھی۔ وہ اسے لے کر ایک بوتیک میں داخل ہو گیا۔ وہ نہ کپڑوں کو دیکھ رہی تھی اور نہ کسی اور چیز کو۔ وہ بس اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تمہیں کوئی بھی ڈریس اچھا نہیں لگ رہا؟'' کافی دیر بعد اس نے اس سے پوچھا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے کے بجائے ہینگرز میں لٹکے مختلف ملبوسات پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ وہ جواباً بے بسی سے سر جھکا کر رہ گئی۔ اس کے جواب نہ دینے پر اس نے ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی۔

''تمہارا شاپنگ کا دل نہیں چاہ رہا۔ چلو میں تمہیں کہیں سے اچھا سا ڈنر کرا دوں پھر گھر واپس چلیں گے۔''
اس سے کہتے ہوئے اس نے باہر جانے والے راستے کی طرف اپنے قدم موڑ لیے۔ وہ ڈنر کی بات سن کر مزید گھبرا گئی تھی۔ اس کے ساتھ کسی ہوٹل میں جانا اور کھانا کھانا' وہ اس بات کو سوچ کر ہی بوکھلا گئی تھی۔

وہ زندگی میں پہلی دفعہ کہیں باہر کھانا کھانے آئی تھی۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں تو کیا اس نے کبھی کسی عام سے ہوٹل میں بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ اچھے ہوٹلز اندر سے کیسے ہوتے ہیں یہ اس نے صرف فلموں اور ڈراموں ہی میں دیکھ رکھا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ دل ہی دل میں اپنے اندر اعتماد پیدا ہو جانے اور اپنا نروس نیس پر قابو پا لینے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

''اسٹیمڈ رائس (Steamed Rice) منگواؤں؟ سلاد کون سی ٹھیک رہے گی۔ رشین یا اٹالین؟ روسٹ چکن اور فرائیڈ فش کھاؤ گی؟ یہاں فرائیڈ ویجی ٹیبلز جن چیزوں کے ساتھ سرو کیے جاتے ہیں بہت ہی مزے کے ہوتے ہیں۔ ٹرائی کرو گی؟'' وہ ہر ڈش پر صرف اقرار میں سر ہلانے کا کام کر رہی تھی۔

جب تک کھانا سرو نہیں ہوا وہ اسے اپنے پچھلی دفعہ اس ہوٹل میں آنے کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ ایک بزنس ڈنر کے لیے یہاں آیا تھا اور اسے یہاں کا کھانا بہت پسند آیا تھا' اس لیے آج وہ اسے لے کر یہاں دوبارہ آ گیا تھا۔ ویٹر نے کھانا سرو کر دیا تو وہ اسے کھانا شروع کرنے کے لیے کہتے ہوئے خود بھی اپنی پلیٹ میں سلاد ڈالنے لگا۔

اپنی پلیٹ میں فرائیڈ فش اور چاول ڈالتے ہوئے وہ اس بات پر حیران ہو رہی تھی کہ اس کی ساری گھبراہٹ اور سارا خوف جو اس میز پر بیٹھ جانے تک موجود تھا اس وقت یکسر غائب ہو چکا تھا' وہ اس وقت ذرا سی بھی نروس نہیں تھی۔ اس کی ہتھیلیوں پر ہوٹل میں داخل ہونے تک جو پسینہ پھوٹ رہا تھا وہ اب بالکل خشک ہو چکا تھا۔ اسے اس وقت حیدر مسعود کے سامنے بیٹھے ہوئے ذرا سی بھی گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی جب کہ وہ سارے راستے اسی وقت سے گھبراتی آئی تھی۔ اس نے کھانا کھانا شروع کر دیا' وہ خود بھی بڑے مگن سے انداز میں کھانا کھا رہا تھا۔ ''یہ چکن بھی تو لو۔'' اس نے اپنی پلیٹ میں چکن کا ایک پیس ڈالنے کے بعد ایک پیس اس کی پلیٹ میں بھی رکھ دیا۔

''تمہیں کوکنگ آتی ہے؟'' اس کی نظریں اپنی پلیٹ پر تھیں لیکن وہ مخاطب اسی سے تھا۔

''بہت زیادہ نہیں' بس پاکستانی کھانے بنانے آتے ہیں۔'' وہ اس طرح بغیر تردد کیے ہوئے اس کی با
جواب دینے پر خود ہی دل بھر کر حیران ہوئی۔

''سیکھ ڈالو پھر۔ شوہر حضرات بیویوں کی اس خوبی سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ ابھی تو تمہارے پاس
سال ہیں سیکھنے کے لیے۔ پھر دیکھنا آگے یہ خوبی تمہارے کس قدر کام آئے گی۔'' وہ جیسے اسے کوئی گر کی با
رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دم ہی سرخی سی پھیل گئی۔ وہ اس کے چہرے پر بکھرتے اس رنگ کو دیکھ کر محظو
انداز میں ہنسا۔

''میں نے تم سے ابھی تک یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ تم کیا پڑھتی ہو؟''

''میں نے بی اے کیا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے اسے بتایا تو وہ بی اے میں اس کے مضامین کے با
میں پوچھنے لگا۔ وہ بہت آرام سے کھانا کھاتے ہوئے اسے اپنے مضامین کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''ہیلو حیدر۔'' ان دونوں کے قریب ایک خوب صورت نسوانی آواز ابھری تو ان دونوں نے چونک کر آوا
سمت دیکھا۔

''ہیلو۔'' حیدر نے اس لڑکی کو جواباً ہیلو کہا۔

''کیسے ہیں آپ؟'' اس لڑکی نے بڑے غور سے ایمن کی طرف دیکھا اور پھر حیدر سے اس کی خیر
دریافت کی۔ ایمن اس وقت واقعی گاؤں کی گوری والے انداز میں گنواروں کی طرح اس لڑکی کو تک رہی تھی۔
نے بلیک کلر کی سلیولیس قمیص جس کا گلا بھی خاصا گہرا تھا اس کے ساتھ بلیک ہی کلر کا ٹراؤزر پہنا ہوا تھا۔ ٹراؤ
پائنچہ اس حد تک کھلا ہوا تھا کہ اس کی بے حد سڈول اور گوری پنڈلیاں بہت آرام سے نظر آ رہی تھیں۔ سیاہ رنگ
دوپٹہ اس کے ایک کندھے پر جھول رہا تھا۔ اپنے کمر تک آتے سلکی بالوں کو وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بڑی ادا
ہاتھوں سے پیچھے کر رہی تھی۔

اتنی زبردست ایکسپوزنگ کے ساتھ اس نے میک اپ بھی بہت نفاست اور سلیقے سے کر رکھا تھا۔ ایک
خوب صورت تھی اس پر اسے میک اپ کا ڈھنگ بھی تھا۔ وہ پلکیں جھپکائے بنا اس لڑکی کو تکتے ہوئے یہ سوچ
تھی کہ جب میں لڑکی ہو کر اس پر سے نظریں نہیں ہٹا پا رہی تو حیدر مسعود کا کیا حال ہو گا؟ وہ سراپا حسن تھی اور
حسن کو اس نے ہر ہر طرح اجاگر کرنے کی پوری پوری کوشش بھی کر رکھی تھی۔ اس نے ایک چور نگاہ حیدر پر
لیکن اسے بڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اس کی طرح منہ پھاڑے اس لڑکی کے حسن اور اداؤں سے متاثر
ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس لڑکی کے ساتھ بڑے مہذب انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں شائستگی
لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک بات اور بھی تھی۔

اسے حیدر کے اس لڑکی کے ساتھ اس طرح مغرورانہ اور پرتکلف انداز میں گفتگو کرنے پر بے ساختہ ا
حیدرآباد میں زینت خالہ کے گھر والوں سے ملنے والا انداز یاد آ گیا۔ ان لوگوں سے بھی وہ بالکل اسی طرح با
کر رہا تھا' بظاہر بڑی شائستگی کے ساتھ لیکن اس کے لہجے میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جو مخاطب کو اس سے

متکلف ہونے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ لیے دیے مغرور اور پرتکلف انداز میں باتیں کرنے والا حیدر مسعود اس شخص سے بہت مختلف لگ رہا تھا جسے وہ پچھلے کئی دنوں سے اپنے ساتھ اپنائیت اور بے تکلفانہ انداز میں باتیں کرتا دیکھ رہی تھی۔

اپنی کم عمری اور کم علمی کے باوجود اسے پوری طرح اندازہ تھا کہ وہ لڑکی ہر انداز سے حیدر کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ متاثر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کی انگریزی میں کی جانے والی گفتگو کا انگریزی میں ہی جواب دے رہا تھا۔ مگر اس کا لہجہ کتنا سپاٹ اور کسی قسم کی گرم جوشی سے عاری تھا۔

”چلیں پھر ملاقات ہوگی آپ سے۔ میں یہاں اپنی فرینڈز کے ساتھ ڈنر کرنے آئی تھی۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہیں۔“ اب اس لڑکی کی آنکھوں میں مایوسی اور غصہ نظر آ رہا تھا لیکن اس نے اپنے لہجے میں اس مایوسی اور غصے کو شامل نہیں ہونے دیا۔ حیدر سر ہلاتے ہوئے دوبارہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا جب کہ وہ ابھی تک اسی لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی اپنی دوستوں کی طرف جا رہی تھی۔

”کیا یہ شخص اتنی حسین لڑکی کو نظر انداز کر سکتا ہے؟ جب کہ وہ دل و جان سے اس پر نثار ہو رہی ہے۔ اس کا دھیان ایک دم ہی حیدر کی بیوی کی طرف گیا۔ وہ کتنی حسین ہوگی، وہ کتنی شاندار شخصیت کی مالک ہوگی۔ اس غیر معمولی اور شاندار شخصیت کے پاس موجود کوئی بھی شخص اور کوئی بھی چیز معمولی نہیں ہو سکتی۔ اس سے وابستہ ہر شخص اس کی طرح ہوگا۔

”کیا ہوا بھئی، کھانا کھاؤ۔“ اس نے اسے ٹوکا تو وہ جلدی سے اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

”میٹھے میں کیا لوگی؟ آئس کریم یا کچھ اور؟“ اس کے ساتھ وہ وہی حیدر تھا۔ خوش اخلاق اور مہربان۔ وہ اس شخص کے اتنی جلدی جلدی بدلتے موڈ کو تعجب سے دیکھ رہی تھی۔

”آئس کریم منگوا لیں۔“ اس نے بجائے انکار کرنے کے آئس کریم کے لیے ہامی بھر لی۔ حیدر نے اپنے لیے آئس کریم آرڈر نہیں کی۔ اس نے اپنے لیے کافی منگوائی۔ وہ کافی پیتے ہوئے اسے اپنے اسکول کے دنوں کی کچھ شرارتوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔

”میں بچپن میں بہت شرارتی تھا، ماریہ بڑی سوبر سی بچی تھی۔ اسے میں اپنی شرارتوں میں شامل کرتا تو وہ ڈرتے ہوئے کہتی تھی۔ ”بھائی! پاپا ناراض ہوں گے، بی بی سے ڈانٹ پڑے گی۔“ وہ ہنستے ہوئے اسے بتانے لگا پھر جیسے اسے اچانک یہ بات یاد آئی کہ ایمن، ماریہ سے کیونکر واقف ہو سکتی ہے۔ وہ اس کے بارے میں کچھ بولنے سے پہلے خود ہی بول پڑی۔

”مجھے پتا ہے، وہ آپ کی بہن ہیں اور وہ بوسٹن میں رہتی ہیں۔“

”میرے پیچھے تمہاری معلومات تو قابلِ رشک حد تک بڑھ چکی ہیں۔“ وہ اس کے بے ساختگی میں بولنے کو انجوائے کرتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ وہ کافی پی چکا تھا اب وہ اس سے باتیں کرتے ہوئے پوری توجہ سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اس کی اپنی طرف دیکھنے سے بالکل بھی گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اس کی باتوں کے جواب بھی دے رہی تھی۔

”آئس کریم اور منگواؤں؟“ اس نے اپنی آئس کریم ختم کی تو اس نے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کچھ اور لو گی؟“ اس نے اس بار بھی نفی میں سر ہلا دیا تو وہ پوچھنے لگا۔

”چلیں پھر؟“ اس نے اقرار میں گردن ہلائی تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”تم جب ہاں اور نہ کہنے کے لیے زبان کا استعمال کرنے کے بجائے گردن اور سر کا استعمال کرتی ہو تو واقعی بہت کیوٹ لگتی ہو۔“ وہ کچھ جھینپ سی گئی۔ واپسی میں جاتے وقت کی طرح ان دونوں کے درمیان خاموشی نہیں تھی۔ گاڑی پورچ میں لا کر روکتے ہوئے وہ پورا کا پورا اس کی طرف گھوما۔

”تم بور ہوئیں؟“ اس نے بجائے نفی میں سر ہلانے کے منہ سے نہیں کہا۔

”تم نے انجوائے کیا؟“

”ہاں۔“ اس نے سنجیدگی سے ہاں کہا تھا اور اس کے چہرے پر سنجیدگی کی جگہ شرارتی مسکراہٹ نے لے لی۔

”اب کیونکہ میں نے تعریف کر دی ہے، اس لیے تم منہ سے جواب دیا کرو گی۔“ وہ دونوں گاڑی سے اتر گئے تھے۔ حیدر بھی اسے شب بخیر کہتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹنے کے بعد آج کی ساری باتوں پر حیران ہو رہی تھی۔ اس شخص کے پاس ایسا کیا جادو ہے۔ وہ اس سے جتنا بھی گھبرائے، جتنا بھی خائف ہ جب وہ پاس آ کر بیٹھتا ہے تو سارا خوف اور ساری گھبراہٹ کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ اس گھ یں آنے کے پہلے دن سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔

اس شخص میں کوئی جادو ہے، کوئی کرزما ہے، کوئی مقناطیسیت ہے، جو اسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ وہ خو بخود اس کے زیرِ اثر آ جاتی ہے۔ اسے اس کی باتیں اچھی لگتی ہیں، اسے اس کا اپنائیت بھرا انداز اچھا لگتا ہے، اے اس کے پرمزاح فقرے اچھے لگتے ہیں۔

* * *

اسے یہاں آئے ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ توفیق کمال نے دوبارہ اسے فون نہیں کیا تھا۔ حیدر نے تیر چار روز پہلے آفس میں ان کا فون آنے کا ذکر کیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ اس سے ایمن کی خیریت معلو کر رہے تھے۔ اسے اس کی اس بات پر بالکل یقین نہیں آیا۔ اگر انہیں اس کی خیریت کی اتنی فکر ہوتی تو وہ اے گھر پر فون کر سکتے تھے۔

بی بی اور حیدر کا رویہ اس کے ساتھ اول روز جیسا ہی تھا۔

وہ آفس سے آنے کے بعد خاص طور پر ڈنر کرتے ہوئے اور پھر ڈنر کے بعد چائے یا کافی پیتے ہوئے اس سے بہت ساری باتیں کرتا تھا۔ یونہی عام سے موضوعات پر۔ ان باتوں کے دوران اس کی حیثیت محض سامع کی ہی ہوتی تھی۔

اس روز چھٹی کا دن تھا۔ وہ دیر سے سو کر اٹھی تھی، اس نے اور بی بی نے ایک ساتھ ناشتہ کیا جبکہ حیدر ان تو گوا سے پہلے ہی ناشتہ کر چکا تھا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھ کر اخبار دیکھ رہا تھا۔ ناشتے کے بعد ایمن اور بی بی بھی لاؤنج م آ گئیں۔ حیدر نے میگزین اپنے پاس رکھ کر باقی اردو اور انگریزی کے دونوں اخبارات اس کی طرف بڑھا دیے

اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر اس نے اپنی عادت کے مطابق اخبار کے ایڈیٹوریل صفحے پر نظر ڈالنی شروع کر دی تھی۔

''کیوں حیدر! لنچ کے لیے کیا بنواؤں؟'' پروین کو لنچ کے لیے ہدایت دیتے دیتے بی بی نے حیدر سے پوچھا۔ ''بتاؤ ام ایمن! لنچ میں کیا کھاؤ گی؟'' وہ بی بی کو جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھنے لگا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

''کچھ بھی۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''بس پھر بی بی آج لنچ میں ''کچھ بھی'' بنوالیں بائی داوے مس ام ایمن! یہ کچھ بھی روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے یا چمچ کے ساتھ یا پھر چھری اور کانٹے کے ساتھ؟ یونہی میں اپنی نالج کے لیے پوچھ رہا ہوں۔''

بی بی کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ پروین بھی سر جھکائے مسکرا رہی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر ذرا سی بھی مسکراہٹ نہیں تھی۔ وہ بری طرح شرمندہ ہوگئی۔

''تم سے جو بات پوچھی جاتی ہے' اس کا سیدھا سادا جواب نہیں دے سکتیں؟'' وہ اپنے چہرے پر کچھ مصنوعی سی خفگی لاتے ہوئے بولا۔

''کوئی سی بھی سبزی۔'' اس کی طرف دیکھے بغیر وہ آہستہ سے بولی۔

''کچھ بھی' کوئی بھی یہ کچھ بھی اور کوئی بھی کیا اردو زبان میں تمہارے پسندیدہ الفاظ ہیں۔''

''پالک یا بھنڈی۔'' وہ اپنی پسند کی سبزیوں کے نام لینے پر مجبور ہوگئی۔

''اتنی لمبی چوڑی گفتگو کے بغیر میرے پوچھنے پر پہلی دفعہ ہی بتا دیتیں تو کوئی حرج تھا؟'' بی بی' حیدر اور ایمن پر سے توجہ ہٹا کر اب دوبارہ پروین کو کھانے کے بارے میں بتانے لگیں۔

شام میں وہ لان میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ جب وہ اس کے پاس چلا آیا۔

''اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے۔ آؤ' تھوڑی دیر لان میں واک کریں۔'' وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ہوگئی۔ ''کیا ہم اسی طرح خاموشی سے ٹہلتے رہیں گے؟'' پچھلے دس منٹ سے ان کے درمیان خاموشی تھی۔

''بھئی' کوئی بات کرو۔ میں بور ہونے لگا ہوں۔'' وہ جھنجھلائے ہوئے انداز میں چڑ کر بولا۔

''کیا بات کروں؟'' جو اس نے دل میں سوچا تھا وہی اس کے لبوں سے بھی نکل گیا تھا۔

''اب یہ بھی میں بتاؤں۔ بھئی کسی بھی موضوع پر بات کرو۔ اتنے دنوں سے تمہارے ساتھ باتیں کر رہا ہوں' آج تم میرے ساتھ باتیں کرو۔ مجھ سے میرے بارے میں کچھ پوچھو۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔ چلو یہی بتا دو کہ تمہارا اسٹار کیا ہے؟ تمہارا فیورٹ ایکٹر اور ایکٹریس کون ہے؟ تمہیں پھول کون سا پسند ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔'' وہ اسے تفصیلاً گفتگو کے لیے مواد فراہم کرنے لگا۔ اس نے ایک پل کے لیے کچھ سوچا اور پھر ہچکچائے ہوئے انداز میں بولی۔

''آپ نے کیا پڑھا ہے؟ میرا مطلب ہے آپ کی کوالیفکیشن۔''

''میں نے ایم بی اے کیا ہے۔'' اس کا جواب بہت مختصر اور سادہ سا تھا۔ ایمن نے بغور اس کی طرف دیکھا اس نے اندازہ لگایا کہ وہ جان بوجھ کر اپنے بارے میں اتنے سادہ اور عام سے انداز میں بات کر رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ یہ شخص اس سے بہت بڑھ کر تھا جتنا وہ اس کے سامنے خود کو ظاہر کرتا تھا۔

''کہاں سے؟'' اس کے سوال میں اس بار ہچکچاہٹ پہلے سے قدرے کم تھی۔ اس نے چونک کر ایمن کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں نظر آتے سوالوں کو دیکھ کر مسکرایا۔

''یہ سوال کیوں پوچھا تم نے؟ پہلے اس بات کا جواب دو' پھر میں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔''

''مجھے ایسا لگا کہ آپ نے کسی بہت اچھی یونیورسٹی سے پڑھا ہے۔'' وہ اسے یہ نہیں بتا سکی کہ وہ اس کی تعلیمی قابلیت مکمل تفصیل کے ساتھ اس لیے جاننا چاہتی ہے' کیونکہ وہ اس کے باپ کا ایک انتہائی قریبی واقف کار ہے اور اس کی ماں نے اسے بتایا تھا کہ توفیق کمال اپنے پاس کسی معمولی آدمی کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ اس کی نگاہوں میں موجود سنجیدگی دیکھ کر خود بھی سنجیدہ ہوگیا۔ اسے شاید یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس کی تعلیمی قابلیت پوری تفصیل کے ساتھ جاننا چاہتی ہے۔

''مارٹن اسکول سے۔'' اس کے جواب پر وہ متاثر ہو جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی' حالانکہ اسے ایسے ہی کسی ادارے کا نام سننے کی توقع تھی پھر بھی سننے کے بعد وہ اپنے تاثرات چھپا نہیں پائی تھی۔

''اور؟''

''اور کیا؟'' وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اسے اس رات ہوٹل میں ملنے والی اس لڑکی کا حیدر سے کسی کورس سے متعلق استفسار یاد تھا' اسی لیے اس نے یہ سوال پوچھا تھا۔

''بھئی' میں توفیق بھائی جتنا قابل نہیں ہوں۔ اب اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں کہوں گا کہ اور میں نے ان کی طرح ہارورڈ بزنس اسکول سے پی ایچ ڈی کر رکھا ہے' تو افسوس ایسی کوئی قابلیت میرے پاس نہیں ہے۔'' یہ اس کی معلومات میں ایک نیا اضافہ ہے۔ اس نے نبی امی سے یہ سن رکھا تھا کہ وہ بے تحاشا ذہین ہیں' انہوں نے آ بی اے سے ایم بی اے کیا ہوا ہے' وہ بھی پہلی پوزیشن اور گولڈ میڈل کے ساتھ۔ اس کا دل ایک دم ہی بہت سے وسوسوں میں گھر گیا۔ وہ اسے رد کر دیں گے۔ اس کے چہرے پر گہری اداسی اور مایوسی چھا گئی تھی۔

''ویسے میں نے ہارورڈ سے مارکیٹنگ میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما بھی کر رکھا ہے اس کے علاوہ بھی تین چا ڈپلوما کورسز اور کر رکھے ہیں۔ پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر بزنس کی مصروفیات اس کام کے لیے مہلت نہیں دے رہیں۔ دیکھو' شاید آنے والے سالوں میں یہ کام کر ہی ڈالوں۔ وہ اتنا قابل تھا جبکہ اس کا علم اور اس کی تعلیم بڑی محدود سی تھی۔

وہ تو اسے یہ بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ اس نے ہارورڈ مارٹن اسکول اور لندن اسکول آف اکنامکس کے صرف نا سن رکھے ہیں۔

اس کا احساس کمتری پوری طرح اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ وہ اس کے آگے خود کو بالکل جاہل سمجھ رہی تھی۔

”تم چپ کیوں ہو گئیں؟ کچھ اور پوچھو؟“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس نے بغور حیدر مسعود کی طرف دیکھا، لیکن بولی کچھ نہیں۔

”تم کچھ نہیں پوچھ رہیں تو پھر چلو میں تم سے کچھ پوچھ لیتا ہوں۔“ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

”تم آگے کیا پڑھنا چاہتی ہو؟“ ہاہ! اس کے مستقبل کے خواب۔ اس کے دل سے ایک آہ نکلی تھی۔ اس کے سب خواب بکھر چکے تھے۔

”میں نے ابھی کچھ سوچا نہیں ہے۔“ وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ لیکن وہ اس کی آنکھوں میں ٹھہرے ان پانیوں کو دیکھ چکا تھا۔ اسی لیے اس نے فوراً ہی موضوع تبدیل کر دیا۔

”تمہیں شعیب اختر زیادہ پسند ہے یا بریٹ لی؟“

اس نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھا ”بتاؤ بھئی؟“۔

”مجھے کرکٹ میں بہت دلچسپی نہیں ہے۔“ وہ اس کے ایک دم موضوع تبدیل کر دینے پر حیران ہوئی لیکن پھر بھی اس نے اس کے سوال کا جواب دے دیا۔

”اچھا کرکٹ میں نہیں ہے تو پھر فلموں میں تو ضرور ہوگی۔ یہ بتاؤ تمہیں کیسی فلمیں پسند ہیں؟“ لان چیئر پر بیٹھتے ہوئے اس نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے دور سے نظر آتے ملازم کو آواز دے کر پاس بلایا اور اس سے دو گلاس ایپل جوس لانے کے لیے کہا۔ پھر اس کے ساتھ بیٹھ کر جوس پیتے ہوئے وہ اس سے فلموں اور شوبز کے بارے میں ہی باتیں کرتا رہا۔

* * *

رات کے کھانے کے بعد کمرے میں جا لیٹنے پر خلاف معمول اسے جلدی نیند آ گئی تھی۔ لیکن سونے کے فوراً بعد ایک بہت ہی برا خواب دیکھنے پر وہ خوفزدہ سی ہوتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ اپنے رد ہونے کا جو خوف اس کے اعصاب پر سوار تھا اس نے خواب میں بھی وہی دیکھا تھا۔ توفیق کمال ام ایمن کو قبول کرنے سے انکار کر رہے تھے۔

وہ زینب توفیق کی ہی جیسی معمولی اور بالکل عام سی لڑکی کو اپنی بیٹی کی حیثیت سے قبول کرنے اور اپنے ساتھ رکھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ امی ان سے التجائیں کر رہی تھیں کہ وہ اپنے گھر میں اپنی بیٹی کو تھوڑی سی جگہ دے دیں۔ وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ اسے اس پل کمرے میں پھیلے اندھیرے اور خاموشی سے بے تحاشا ڈر لگا۔ اس نے اٹھ کر لائٹ جلائی، پانی پیا، مگر اس کا خوف اور ڈر پھر بھی ختم نہیں ہوا۔ وہ بے ساختہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی، اس کا رخ لاؤنج کی طرف تھا۔ اسے اس وقت آوازیں چاہیے تھیں، شور چاہیے تھا، ایسا شور جو اس کے اندر کے شور کو دبا سکے، اسی لیے وہاں آ کر اس نے جلدی سے ٹی وی آن کیا۔ بی بی بھی اس کی طرح کھانے کے فوراً بعد اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں جبکہ حیدر ابھی تک گھر واپس نہیں آیا تھا۔ اسے آج آفس میں کسی کام کی وجہ سے دیر تک رکنا پڑ گیا تھا اور وہ بی بی کو فون کر کے اپنے دیر سے گھر واپس آنے سے آگاہ کر چکا تھا۔ ابھی وہ صوفے پر بیٹھی بھی نہیں تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ خوفزدہ سے انداز میں اس نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔

”ٹی وی دیکھا جا رہا ہے۔“ وہ اسے دیکھ کر حسب عادت خوش دلی سے مسکرایا۔ پھر کچھ بے فکرے اور لاپرواہ سے انداز میں دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اپنا کوٹ اور موبائل بھی اس نے یونہی لاپروائی سے صوفے پر ڈال دیے تھے۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ وہ اس سے خود کو چھپا کیوں نہیں پاتی، اسے خود سخت غصہ آیا۔

”ٹھیک ہے۔“ چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے اس نے خود پر سے ڈر، خوف، مایوسی اور بے بسی والے تمام تاثرات کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی۔ وہ بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم ابھی بیٹھی ہو یہاں پر؟“ ایک دم ہی صوفے پر سے اٹھتے ہوئے اس نے اس سے پوچھا۔

”میں دس پندرہ منٹ میں آتا ہوں۔ پھر ہم ساتھ بیٹھ کر کافی پئیں گے۔“ اس کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ مزید گویا ہوا اور پھر اپنا کوٹ اور بریف کیس اٹھاتے ہوئے لاؤنج سے نکل گیا۔ جبکہ موبائل وہ صوفے پر ہی چھوڑ گیا تھا۔

”چائے تو میں تمہیں بنا کر پلا چکا ہوں۔ آج تم میرے ہاتھوں کی بنی ہوئی کافی بھی پی کر دیکھ لو۔ تم اتنی دیر ٹی وی دیکھو۔ میں بس جلدی سے کافی بنا کر لا رہا ہوں۔“ صبح آٹھ بجے آفس جا کر رات ساڑھے گیارہ بجے گھر واپس آنے کے بعد وہ بجائے اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنے کے اس کی مہمان نوازی کے لیے خوشی خوشی تیا رہتا۔ ”یہ رہی تمہاری ایک چمچ چینی والی کافی اور یہ میری دو چمچ والی۔“ اسے اس کے لاؤنج میں آنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس نے ٹرے ٹیبل پر لا کر رکھتے ہوئے یہ بات کہی تو وہ چونکی۔ وہ اپنا مگ لے کر اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”اتنی دبلی پتلی سی تو ہو، تمہیں ڈائٹنگ کی کوئی ضرورت ہے تو نہیں۔“ کافی کا پہلا گھونٹ لیتے ہوئے اس نے اس کی ایک چمچ چینی پر تبصرہ کیا۔ وہ مروتاً مسکرا دی۔

”کیسی ہے کافی؟“ وہ اس کے منہ سے اپنی بنائی کافی کی تعریفیں سننے کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

”بہت مزے کی ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے فوراً تعریف کر دی۔ اسی وقت اس کے موبائل نے شور مچایا۔ اسی لاپرواہ سے انداز میں کافی کے سپ لیتے ہوئے اس نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو۔“ دوسری طرف سے آنے والی آواز کو سن کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی جگہ اچانک ہی سنجیدگی او کچھ غصے نے لے لی تھی۔

”آپ یہ بے کار کے ایکسکیوزز مجھے مت دیں۔ غیر ذمہ داری اور لاپروائی میں کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ کی گھریلو زندگی کی کیا مجبوریاں ہیں وہ آپ مجھے مت سنائیں۔ اگر آج میں نے غور سے ا پیپرز کو اسٹڈی نہ کر لیا ہوتا تو کچھ اندازہ ہے آپ کو، ہمیں کتنا نقصان ہوتا۔ اتنے اہم کانٹریکٹ میں اتنی بڑی بڑ غلطیاں۔“ اس کا لہجہ کسی بھی قسم کی مروت سے عاری تھا۔ وہ نہ تو چیخ رہا تھا اور نہ ہی اس کا لہجہ بدتمیزی ڈالا تھا

لیکن پھر بھی اس میں کوئی بات تھی جو ڈرا رہی تھی۔ مالکانہ تحکم لیے وہ اپنے مخاطب سے جس طرح بات کر رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس کی غلطی معاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ محض پانچ منٹ میں ہی وہ بات ختم کر کے موبائل ٹیبل پر رکھ کر دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”تمہیں کیا ہوا؟ تھوڑی دیر پہلے تو اچھی خاصی بیٹھی تھیں۔“ اس کے چہرے پر دوبارہ مسکراہٹ تھی۔

”کچھ نہیں۔“ آہستگی سے جواب دیتے ہوئے اس نے اپنا کافی کا خالی مگ واپس ٹرے میں رکھ دیا۔ چند سیکنڈ تک وہ خاموشی سے کافی کے سپ لیتا ہوا اس کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر اس نے صوفے کے بالکل پاس اپنے دائیں ہاتھ پر رکھی سائڈ ٹیبل پر پڑا ہوا رائٹنگ پیڈ اور پین اٹھایا اور اس سے بولا۔

”Hang Man کھیلو گی؟“ وہ اچنبھے سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ بہت فریش اور بالکل فارغ نظر آ رہا تھا۔ اس کی حیرت سے بے نیاز۔ اپنے ہاتھ میں پکڑا رائٹنگ پیڈ اور پین اس نے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیے تھے۔

”تم ابھی تک صوفے پر جمی بیٹھی ہو۔ یہاں آ کر بیٹھو۔“ اس نے اپنے سامنے رکھے دوسرے فلور کشن کی طرف اشارہ کیا۔

”آتا ہے ناں تمہیں Hang man کھیلنا۔ بچپن میں ضرور کھیلا ہو گا تم نے۔ میں اور ماریہ تو ہینگ مین بہت زیادہ کھیلا کرتے تھے۔“ وہ فلور کشن پر آ کر بیٹھی تو وہ اس سے بولا۔ ان کے درمیان ٹیبل تھی۔

”پہلی باری میری ہے۔“ وہ پین اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس سے بولا۔

”میری Vocabulary (ذخیرہ الفاظ) زیادہ اچھی نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کھیل سکتی۔“ وہ بہت شرمندگی سے سر جھکا کر بولی۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میری بھی Vocabulary کچھ خاص نہیں۔ تم کھیلو گی تو تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا۔ ہمیشہ ماریہ Hang man میں مجھ سے جیتا کرتی تھی۔ آخری بار شاید ہم دونوں نے یہ اس وقت کھیلا تھا جب میں چودہ سال کا تھا اور اس روز بھی ماریہ ہی جیتی تھی۔ اس کی Vocabulary بہت زبردست ہے۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے ایسے لفظ ڈھونڈ ڈھانڈ کر لاتی تھی کہ جو میں نے کبھی سنے ہی نہیں ہوتے تھے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بڑے اطمینان سے اپنی کمزوری کا اعتراف کر رہا تھا۔

”چلو کھیل شروع کریں؟“ اس نے اس سے پوچھا۔ پھر اس کے جواب دینے سے پہلے کاغذ پر پین سے اشارہ کر کے اسے بتانے لگا۔ ”دیکھو یہ ایک لفظ ہے۔ اس میں پانچ Letters ہیں۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ لفظ کیا ہے۔“ کچھ بوکھلائے ہوئے انداز میں اس نے کاغذ پر نگاہیں دوڑائیں۔ اس شخص کے سامنے کم علم اور نالائق ثابت ہونے کا تصور اس کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔

”مجھے کچھ بھی نہیں آتا۔ بالکل ڈل، ڈفر اور کند ذہن ہوں میں۔ کیا سوچے گا یہ کہ توفیق کمال کی بیٹی میرا پوچھا ہوا ایک عام لفظ بھی نہیں بوجھ سکی۔“ دل ہی دل میں اپنے آپ سے یہ باتیں کرتے ہوئے اس نے ایک ایک کر کے سارے Vowels بول دیے تھے۔

اس نے دو Blanks میں E اور I لکھ دیا تھا۔ اسے خود اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ اس کے صرف E او I لکھ دینے کے بعد ہی لفظ کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اس نے تکا مارنے والے انداز میں T بولا اس پہلے Blank اور T لکھ دیا Tepid وہ ایک دم سے بقیہ حروف بولنے کے بجائے پورا لفظ ہی بول گئی۔

”اتنی جلدی بتا دیا تم نے، میں سمجھ رہا تھا کہ کم از کم آدھا گھنٹہ تو تم سوچ بچار میں ضرور لگاؤ گی بول ایسے رہی تھیں کہ میری Vocabulary اچھی نہیں ہے اور صرف دو منٹ میں میرا پوچھا لفظ بتا دیا۔“ اس نے اسے گھو اور پھر رائٹنگ پیڈ اس کی طرف کرتے ہوئے پین اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

”اب تمہاری باری ہے۔ کوئی آسان سا لفظ پوچھنا۔ ایسا جو میں آرام سے بتا سکوں۔“ پین ہاتھ میں لے ک اس نے ایک دو منٹ سوچا پھر کسی لفظ کے بارے میں مطمئن ہونے کے بعد کاغذ کی طرف متوجہ ہوئی۔

”تم میں اور مجھ میں ایک بات مشترک ہے، بتاؤ کیا؟“ لکھتے لکھتے اس نے سر اٹھا کر حیدر کی طرف دیکھا۔

”ہم دونوں الٹے ہاتھ سے لکھتے ہیں۔“ بغیر کچھ سوچے یا حیران ہوئے اس نے بے ساختہ اسے جواب دیا وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ اس وقت میں اس بارے میں بات کر رہا ہوں۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میں نے تم میں اور اپنے آپ میں کوئی اور چیز ایک جیسی دیکھی ہوتی اور میں اس وقت اس کا ذکر کر رہا ہوتا۔“

”آپ نے یہ بات میرے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھی تھی۔ اسی لیے مجھے لگا کہ اس وقت آپ ا بارے میں بات کر رہے ہیں۔“ اس نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا یہ بتاؤ Left Hnaders کے بارے میں ایک بات عام طور پر کہی جاتی ہے۔ وہ بات کیا ہے؟“

”یہ لوگ غیر معمولی ذہین ہوتے ہیں۔“ وہ رائٹنگ پیڈ سے توجہ ہٹا کر اس کی باتوں کے جواب دینے لگی تھی۔

”تم ہو؟“ اس کے بتانے پر اس نے بے ساختہ پوچھا۔

”نہیں۔“ یہ انکساری یا عاجزی والا نہیں تھا۔ بلکہ یہ نہیں بہت سچائی اور یقین کے ساتھ بولا گیا تھا۔

”میں بھی نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے اس طرح کی باتیں لوگوں نے یونہی اڑا رکھی ہیں۔ ان میں سچائی و چا بالکل نہیں ہے۔“ وہ ذرا مسخرے پن سے بولا۔

”اس کا مطلب ہے، ہم دونوں میں کافی ساری باتیں ایک جیسی ہیں۔ سب سے پہلی یہ کہ ہم دونوں ال ہاتھ سے لکھتے ہیں، پھر یہ کہ ہم دونوں ہی کی Vocabulary بھی بس گزارے لائق ہے، اس کے علاوہ یہ کہ ہ دونوں ہی ذہین بھی نہیں ہیں۔“ وہ اب کاغذ پر اپنی نگاہیں مرکوز کر کے اس کے پوچھے گئے الفاظ کے بارے می غور و فکر کرنے لگا تھا۔

بہت دیر کے بعد وہ لفظ مکمل کرنے میں اس وقت کامیاب ہوا تھا جب اس کے پاس غلطی کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

”شکر میں نے لفظ صحیح بتا دیا' ورنہ تم سے ہار کر مجھے کتنی شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ لڑکیوں سے ہارنا ذرا انسلٹنگ

لگتا ہے ناں۔" وہ صحیح لفظ بوجھ لینے پر بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ ایمن نے ایک نظر بڑے غور سے اس کے خوشی سے جگمگاتے چہرے کو دیکھا پھر پین رائٹنگ پیڈ پر رکھتے ہوئے بولی۔

"آپ نے جان بوجھ کر لفظ مکمل کرنے میں اتنی دیر لگائی ہے۔ مجھے پتا ہے آپ کو بہت پہلے پتا چل گیا تھا کہ میں نے کیا لفظ پوچھا ہے۔" اس کے چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں برہمی تھی۔

"اچھا؟" اس نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تمہیں کیسے پتا چلی یہ بات؟" وہ بجائے اس کی بات کی تردید کرنے کے تمسخرانہ انداز میں پوچھنے لگا۔

"میں بے وقوف نہیں ہوں۔" ایمن کو اس کے انداز پر مزید ناگواری محسوس ہوئی۔

"واقعی؟" وہ مذاق اڑانے والے انداز میں زور سے ہنسا۔

"جب سے میں تم سے ملا ہوں۔ آج پہلی مرتبہ تم سے یہ بات مجھے پتا چلی ہے کہ ام ایمن بے وقوف نہیں ہے۔ ورنہ اتنے دنوں سے تم مجھے اپنے بارے میں یہی بات بتاتی رہی ہو کہ ام ایمن ایک نہایت ہی بے وقوف' نااہل اور کم علم لڑکی ہے۔" وہ اب ہنس تو نہیں رہا تھا لیکن اس کے لہجے میں طنزیہ سا استعجاب موجود تھا۔

اس نے بہت چونک کر براہ راست حیدر کی طرف دیکھا۔ یہ سب لفظ اس نے اس کے سامنے اپنی زبان سے تو کبھی بھی نہیں کہے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اس بات کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔

"یہی تاثر دیتی رہی ہو تم اپنے بارے میں مجھے۔ یہاں تک کہ ابھی اس معمولی سے کھیل کو کھیلنے سے پہلے بھی تم نے مجھ سے یہی بات کہی تھی کہ تم اسے نہیں کھیل سکتیں اس لیے کہ تمہاری Vocabulary اچھی نہیں ہے۔ اب میں تمہاری کون سے بات کا یقین کروں۔ جو تم نے پہلے بتایا وہ یا جو اب کہہ رہی ہو وہ؟" اس نے بڑی متانت سے اس سے پوچھا پھر وہ میز پر اپنی کہنیاں ٹکاتے ہوئے اس کی طرف ذرا جھک کر رازداری والے انداز میں پوچھنے لگا۔

"تم نے ابھی ابھی اپنے بارے میں یہ کہا کہ تم احمق نہیں ہو۔ اب احمق کی ضد تو عقل مند ہے۔ اگر تم بے وقوف نہیں ہو تو پھر عقل مند ہو گی۔ ایک بات فیصلہ کر کے بتا دو کہ تم ان دونوں میں سے کیا ہو۔ تا کہ آئندہ میں تم سے اسی حساب سے بات کروں۔"

"مجھے نیند آ رہی ہے میں سونے جا رہی ہوں۔" وہ گھبرائے ہوئے انداز میں فوراً اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی ہے۔ کسی بڑے کی بات بیچ سے کاٹ کر چلے جانا بدتمیزی میں شمار ہوتا ہے' تمہیں یہ بات کسی نے نہیں بتائی۔" وہ آنکھوں میں ناپسندیدگی لیے اسے گھور رہا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ نہیں پائی۔ ناچار اسے نگاہیں چرا کر اسے وہیں بیٹھا رہنا پڑا۔

"پتا نہیں تم نے اب تک کی زندگی کس طرح کے لوگوں کے بیچ میں گزاری ہے۔ جو تمہیں کبھی کسی نے تمہاری غیر معمولی ذہانت کے بارے میں نہیں بتایا۔" اس کے لہجے میں اچانک ہی نرمی آ گئی تھی۔ اس نے اس کی بات بغیر کسی توجیہ کے سنی۔

"سچ بتاؤ' کیا واقعی کبھی تمہارے کسی ٹیچر نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ تم عام لوگوں سے زیادہ ذہین ہو۔ تم میں

بہت سی صلاحیتیں ہیں۔ اگر ایسا ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ یہی کہنا پڑے گا کہ تمہیں اب تک تمہاری ذہانت اہلیت کو پہچان لینے والے کوئی اساتذہ ملے ہی نہیں۔ کسی نے تمہاری چھپی ہوئی ذہانت کو کبھی دریافت کر کوشش ہی نہیں کی۔ جیسا کہ تم نے خود کو پیش کیا' انہوں نے تمہیں ویسا ہی تسلیم کر لیا۔" وہ بری طرح چونک اٹھانے پر مجبور ہو گئی۔ صرف اس کا دل رکھنے کی خاطر اتنی زیادہ اور اتنی جھوٹی تعریفیں۔ وہ ان تعریفوں پر خ ہوتی اگر جو وہ خود کو ان کا اہل سمجھتی ہوتی۔

"میں نے اپنے جاننے والوں میں کسی بیس بائیس سال کی لڑکی کو شوقیہ اور اپنی خوشی سے اتنے مشکل موض پر کتاب پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا اور میں نے تمہاری عمر کی لڑکیوں کو اخبار میں اتنے شوق سے ایڈیٹوریلز پڑ ہوئے بھی نہیں دیکھا ہے۔ ٹین ایج میں سب لڑکیوں کی دلچسپی اخبار کے شوبز' فیشن اور اسٹائل سے متعلق صفح میں زیادہ ہوتی ہے۔ ایسا تو میں بھی نہیں تھا تمہاری عمر میں۔ تمہاری عمر میں کبھی میں اخبار میں ایڈیٹوریلز کو توجہ نہیں پڑھتا تھا۔ سنجیدہ موضوعات پر لکھے گئے آرٹیکلز اور کالمز بھی کبھی ٹین ایج میں مجھے پڑھنے کے قابل نہیں تھے۔" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ اس کی تعریفوں سے زیادہ اس بات پر ح تھی کہ وہ ان تمام دنوں میں اتنی گہرائی سے اس کا مشاہدہ کرتا رہا تھا۔ جب اس کا مشاہدہ اتنا زبردست ہے نہیں اس نے ایمن کے بارے میں اور بھی کیا کیا کچھ جان لیا ہو گا۔ اسے ان گہری آنکھوں سے بے تحاشا خو محسوس ہوا۔

"اپنے بارے میں منفی انداز سے سوچنا چھوڑ دو ام ایمن! اگر تم ذرا سا بھی اپنی صلاحیتوں کو پہچان لو اور بارے میں مثبت انداز میں سوچنا شروع کر دو تو یقیناً بہت آگے جاؤ گی۔ خود اپنے آپ کو اس بات کا یقین دلا میں بہت اچھی ہوں۔ مجھ میں بہت سی خوبیاں ہیں' پھر دیکھنا تمہاری سوچ میں کتنی تبدیلی آئے گی۔ پھر تم خو ان تمام خوبیوں سے آگاہ ہونے لگو گی جن سے ابھی تم ناواقف ہو۔" وہ اس کی کسی بھی بات پر یقین نہیں کرنا چا تھی۔ لیکن اس کا انداز اتنا ٹھوس اور پختہ یقین لیے ہوئے تھا کہ وہ متحیر سی اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"کافی دیر ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب سو جانا چاہیے۔" وہ ایک دم ہی فلور کشن پر سے اٹھ گیا او اسے شب بخیر کہتا فوراً ہی لاؤنج سے چلا گیا۔

وہ بھی واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ جس خواب سے ڈر کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی تھی اب وہ اس بارے میں سوچنے کے بجائے حیدر مسعود کی کچھ دیر پہلے کہی گئی باتوں کو سوچ رہی تھی۔ جو باتیں آج اس ایمن سے کہی تھیں' وہ اس سے پہلے کبھی کسی نے نہیں کہی تھیں۔

اس نے پڑھائی میں کبھی ایسا کوئی غیر معمولی کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا کہ اس کے اساتذہ اسے کوئی معمولی اہمیت دینے پر مجبور ہو جاتے۔ ہاں یہ تھا کہ اس نے کبھی کوئی ٹیوشنز نہیں پڑھی تھیں۔ اچھا برا جیسا پڑھتی تھی وہ خود ہی پڑھتی تھی۔

وہ اپنی کلاس فیلوز کی طرح کبھی رٹے نہیں لگاتی تھی۔ جو بھی پڑھتی تھی سمجھ کر پڑھتی تھی۔ اس کے چھوٹے اسکول میں ساری ٹیچرز عام سی ہی پڑھی ہوئی تھیں۔ ان کے پڑھانے کا انداز بہت گھسا پٹا اور فرسودہ تھا۔ بع

دفعہ تو سب سے آخری بینچ پر بیٹھی ہوئی وہ عام سی لڑکی ام ایمن تک ان کی غلطیاں پکڑ لیا کرتی تھی۔ لیکن اتنی ہمت اس میں کبھی نہیں ہوتی تھی کہ وہ ٹیچر کو اس کی غلطی بتا سکے۔

اسے ساتویں کلاس میں سوشل اسٹڈیز پڑھانے والی اپنی مس رسالت اچھی طرح یاد تھیں۔ کیسے ایک مرتبہ کلاس میں آ کر انہوں نے سب لڑکیوں کو ان کی چیک ہوئی نوٹ بکس واپس دینے کے بعد اس کی نوٹ بک اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ کھلی ہوئی نوٹ بک اس کے سامنے لہراتے ہوئے زور زور سے چیخ رہی تھیں اور وہ سر جھکا کر کھڑی ہوئی کانپ رہی تھی۔ انہوں نے یورپ کی آبادی' وہاں کے رقبہ اور وہاں کے چند اہم ممالک کے بارے میں ان لوگوں کو ایک مضمون لکھوایا تھا۔ بلیک بورڈ سے نقل کرتے وقت اس نے اپنی عادت کے مطابق وہاں کا رقبہ لکھتے وقت کلومیٹر Km کو اسکوائر کلومیٹر Square Kilokmetre میں تبدیل کر دیا تھا۔

آسٹریا کے دارالحکومت کو روم سے بدل کر Vienna کر دیا تھا۔

دراصل اس روز ان کی کلاس کی تمام کاپیاں چیک ہونے ان کی اسکول کی ہیڈ مسٹریس کے پاس گئی تھیں۔ ان کی وہ غلطی ہیڈ مسٹریس کی نگاہوں سے چھپی رہ سکتی تھی اگر اس نے اپنی کاپی پر sgurare Km اور vienna اتنے نمایاں کر کے الگ رنگ کے مارکر سے نہ لکھے ہوتے۔ یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ ہیڈ مسٹریس نے پوری نوٹ بک میں سے صرف اسی مضمون کو توجہ سے پڑھا تھا اور تمام نوٹ بکس میں ایک ہی جیسی غلطی پائی تھی۔ سوائے سب سے پہلے دیکھی جانے والی نوٹ بک کے جو ام ایمن کی تھی۔ مس رسالت کو اس بات پر اعتراض تھا اس نے وہ کیوں نہیں لکھا جو انہوں نے لکھوایا' وہ خاموش کھڑی ان کی ڈانٹ کھاتی رہی۔ جتنی ڈانٹ وہ ہیڈ مسٹریس سے کھا کر آئی تھیں جب تک اتنی ہی ڈانٹ اور غصہ انہوں نے اسے منتقل نہیں کر دیا' اس وقت تک چپ نہیں ہوئیں۔

اور آج وہ حیدر مسعود کہہ رہا تھا کہ ام ایمن ایک ذہین لڑکی ہے' اس میں بہت سے صلاحیتیں ہیں' وہ ان سب باتوں کا یقین کیسے کر سکتی تھی۔ اسے پتا تھا' اس میں ان میں کوئی بھی خوبی نہیں لیکن وہ حیدر مسعود صرف اس کا دل رکھنے ہی کی خاطر اس کی جھوٹی تعریفیں کتنی سچائی سے کر رہا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ صرف اس کا دل رکھ رہا تھا' اس کے احساس کمتری کو دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا پھر بھی وہ اس کی تعریفوں پر یقین کر لینے سے خود کو روک نہیں پا رہی تھی۔

* * *

اگلے روز آفس سے آنے پر حیدر نے اسے توفیق کمال کی واپسی کے متعلق بتایا تھا۔

''توفیق بھائی کل رات کراچی پہنچ رہے ہیں۔ مجھے آج صبح آفس میں یہ اطلاع مل گئی تھی' لیکن میں بزی اتنا تھا کہ تمہیں فون کر کے یہ خوشخبری سنا نہیں سکا۔'' وہ بڑے خوشگوار موڈ میں اسے اس کے باپ کی واپسی کی خوشخبری دے رہا تھا۔

وہ عجیب سی کیفیات کا شکار تھی۔ جب تک وہ یہاں نہیں تھے' انہوں نے اسے حیدر مسعود کے گھر پر رہنے کے لیے چھوڑا ہوا تھا تو اسے یہ بات بہت بری اور ذلت کا باعث لگتی تھی اور اب جب وہ واپس آ رہے تھے تو وہ سوچ

رہی تھی کہ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اپنے باپ کا سامنا کس طرح کرے گی۔

اس نے اپنا سارا سامان پیک کر لیا تھا۔ حیدر کی اطلاع یہ تھی کہ وہ ایئرپورٹ سے سیدھے یہاں اس کے لیے آئیں گے' اسی لیے وہ شام سات بجے ہی تیار ہو گئی تھی۔ ان کی فلائیٹ کے آنے کا ٹائم رات آٹھ کا تھا۔ توفیق کمال اب سے پہلے اس کے لیے صرف ایک نام تھا جو اس کے تمام سرٹیفکیٹس' ڈگری اور شناخت پر لکھا ہوا تھا۔ وہ نام اب زندہ ہو کر اس کے سامنے آنے والا تھا۔ محبت اسے توفیق کمال سے کبھی ہو نہیں سک لیکن نفرت؟ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس کے دل میں ان کے لیے سرے سے کوئی جذبہ ہی موجود نہیں تھا ایک خوف تھا جو اس کے پورے وجود کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ اگر توفیق کمال نے مجھے رد کر دیا' اس طرح جیسے میری ماں کو کر دیا تھا' پھر میں کیا کروں گی؟ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بغور خود کو دیکھ رہ اپنے پاس موجود سب سے بہترین لباس آج اس نے پہنا تھا۔ چکن کا آسمانی رنگ کا سوٹ' یہ سوٹ اس عید پر بنایا تھا اور فی الحال اس کے پاس اس سے زیادہ نیا اور بہتر لباس دوسرا کوئی نہیں تھا۔

بالوں کی چوٹی بنانے کے بجائے اس نے پونی بنانی چاہی' لیکن اس کے بال اتنے بے رونق سے تھے بنا کر وہ بالکل جھاڑ جھنکار جیسے لگ رہے تھے۔

مایوس ہو کر اس نے دوبارہ چوٹی ہی بنا لی تھی۔ میک اپ اس نے زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔ ہاں اسکو جاب کرنے کے بعد اس نے لپ اسٹک کے ایک دو شیڈز ضرور خرید لیے تھے' لیکن یہاں آتے وقت اسٹک اس کے سامان کے ساتھ نہیں آ سکی تھیں۔

پھر بھی اپنے طور پر وہ جتنی اچھی طرح تیار ہو سکتی تھی' ہوئی لیکن تیار ہونے کے بعد اب جو اس نے خود دیکھا میں تو بہت مایوس ہوئی۔ اتنی تیاری اور کوشش کے باوجود بھی وہ وہی ام ایمن لگ رہی تھی۔ وہی اعت محروم' معمولی شکل صورت والی ام ایمن۔

وہ اپنی ماں سے کتنا زیادہ ملتی تھی۔ بالکل ویسی ہی آنکھیں' ویسی ہی ناک' ویسے ہی ہونٹ' بالکل د عام شخصیت' ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ بی بی کے بلانے پر وہ ڈنر کے گئی تھی لیکن صرف دو تین نوالوں کے بعد ہی اس نے اپنا ہاتھ روک لیا پھر بی بی کے اصرار پر بھی اس نے م نہیں لیا۔ حیدر اس کی طرف دیکھ تو ضرور رہا تھا لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ ان سے نماز پڑھنے کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے اپنی بے چینی اور اضطرا کرنے کی کوششیں کر رہی تھی۔ یونہی ٹہلتے ٹہلتے اس نجانے کتنا وقت ہو گیا تھا کہ دروازے پر دی جا دستک نے اسے ٹھٹک کر رک جانے پر مجبور کر دیا۔

اسے یوں لگا کہ جیسے وہ میلوں کا سفر پیدل طے کرتے کرتے اچانک رکی ہے۔ اس نے دروازہ کھولا جمیلہ کھڑی تھی۔ وہ اسے اس کے باپ کے آنے کی اطلاع دیتی وہاں سے پلٹ گئی۔ وہ کل شام سے اس کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی لیکن اب حقیقت میں وہ وقت آیا تھا تو اس کی حالت بڑی عجیب سی تھی۔ وہ ا بھی کیفیت سمجھ نہیں پا رہی تھی آہستہ آہستہ اپنے قدموں کو گھسیٹتے ہوئے وہ لاؤنج میں داخل ہوئی۔ وہ چارو

آپس میں گفتگو میں مگن تھے لیکن اسے اندر آتا دیکھ کر انہوں نے اپنی گفتگو روک دی۔

''السلام علیکم۔'' اس نے اپنے بالکل سامنے صوفے پر براجمان اس شاندار انسان کو سلام کیا جو اس کا باپ تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' انہوں نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے اس کے سلام کا جواب دے دیا۔ اس نے کل سے لے کر اب تک کیا کیا سوچ ڈالا تھا۔ لیکن حقیقت اس کی سوچوں سے کتنی مختلف تھی۔ باپ اور بیٹی کے زندگی میں پہلی مرتبہ ملنے والے واقعہ میں کوئی فلمی سچویشن پیدا نہیں ہوئی۔

انہوں نے سلام کا جواب دینے کے بعد سرے سے اس سے دوسری کوئی بات کی ہی نہیں' یہاں تک کہ رسمی طور پر اس کی خیریت بھی نہیں پوچھی۔ دل ہی دل میں شاید لاشعوری طور پر وہ ان کی طرف سے ایسے کسی فلمی انداز کی متمنی تھی۔ وہ اسے گلے لگا کر پیار کرنے کی کوشش کریں گے اور۔ وہ ان کے گلے نہیں لگے گی' وہ انہیں پیار نہیں کرنے دے گی۔ ''جس شخص نے زندگی میں کبھی پلٹ کر میری خیر خبر نہیں لی' میں اسے اپنا باپ نہیں مانتی۔ کیا باپ ایسے ہوتے ہیں؟ اپنی اولاد سے اتنے لاپرواہ اور لاتعلق۔'' وہ ایسا کوئی جملہ بولے گی اور پھر وہ جواباً اپنی آنکھوں میں اشک لیے بے بسی سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی کوئی مجبوری اسے بتانے لگیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ایسا کوئی فلمی اتفاق نہیں ہوا۔

وہ بیٹی سے ملنے کے لیے صوفے پر سے نہیں اٹھے تھے لیکن بی بی کے برابر میں بیٹھی وہ حسین عورت ضرور صوفے پر سے اٹھی تھی۔

''کیسی ہو ایمن؟'' وہ ایک قدم آگے بڑھا کر اس کے پاس آئیں' بڑی آہستگی اور نزاکت سے اس کے گال پر پیار کرتے ہوئے انہوں نے اس کی خیریت پوچھی۔ بڑی پیاری خوشبو آ رہی تھی اس عورت کے وجود سے غالباً کسی فرنچ پرفیوم کی۔ لیکن اسے اس عورت کا خوشبوؤں میں بسا ہوا وہ لمس سخت ناگوار گزرا۔

ان کے خیریت پوچھنے پر آہستہ آواز میں جواب دیتی وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ سلام دعا اور خیریت کا یہ وقفہ جو صرف دو منٹوں پر مشتمل تھا' ختم ہوا تو ایک دفعہ پھر وہ لوگ آپس میں اسی طرح بات کرنے لگے جیسے اس کے آنے سے پہلے کر رہے تھے۔

توفیق کمال' حیدر سے اپنی غیر موجودگی کے دوران آفس میں پیش آنے والے خاص خاص واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے تھے اور الماس توفیق' بی بی کو اپنے دورہ امریکہ کی تفصیلات سے آگاہ کر رہی تھیں۔

''زیادہ دن تو ہم رک نہیں سکتے تھے۔ توفیق کو یہاں آفس میں کچھ ضروری کام تھے۔ بس سائر کی سالگرہ کی اور فوراً واپس آ گئے۔ پہلی مرتبہ گھر سے دور ہوا ہے تو بالکل ہی بچہ بن گیا ہے۔ توفیق کا تو آپ کو پتا ہے' اس طرح کی بچکانہ باتوں سے کتنا چڑتے ہیں۔ وہاں سارا وقت لیکچر دیتے رہے کہ اب تم اٹھارہ سال کے ہو چکے ہو' کوئی چھوٹے بچے نہیں رہے جو ماں سے دور رہ نہیں سکتے۔ سنجیدگی سے اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ جیسا رزلٹ میں چاہتا ہوں' ویسا رزلٹ مجھے لا کر دکھاؤ۔ ماریہ اور مکرم اس کا اتنا خیال رکھ رہے ہیں' ویک اینڈز پر اسے گھمانے پھرانے لے جاتے ہیں' ماریہ تو خاص طور پر اس کا بالکل چھوٹے بچوں کی طرح دھیان رکھ رہی ہے۔ ماریہ اور مکرم ہی کی وجہ سے مجھے سائر کی طرف سے مکمل اطمینان ہے۔''

وہ اپنے بیٹے کے بارے میں بی بی سے باتیں کر رہی تھیں اور توفیق کمال' حیدر سے بزنس سے متعل
طرح کی مشکل گفتگو کر رہے تھے۔ وہ اسے سننے کے باوجود سمجھنے سے قاصر تھی۔ ام ایمن پس منظر میں جا
اسے دو منٹ دے دیے گئے تھے وہی اس کی اوقات کے حساب سے کافی زیادہ تھے۔

یہاں زندگی اسی معمول کے مطابق تھی جیسی اس کی آمد سے قبل ہوا کرتی ہوگی۔ اس کی آمد سے ایسا
نہیں آیا تھا کہ وہ اپنے معمول کی گفتگو میں تبدیلی پیدا کر دیتے۔ الماس توفیق کی بی بی کے ساتھ جس طر
تکلفانہ گفتگو ہو رہی تھی' اس سے اسے ان دونوں گھرانوں کی قربت کا بڑی اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔
ان دونوں سے چائے اور کافی کے متعلق پوچھا تو ان دونوں نے انکار کر دیا۔

''کافی دنوں سے نیند پوری نہیں ہو رہی اور پھر اب سفر کی تھکن بھی ہے۔ بس اب جلدی سے گھر پہنچ
دیر تک سونے کا پروگرام ہے۔'' الماس توفیق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ لوگ جانے
اٹھ گئے۔ بی بی نے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔

''اپنے گھر جا کر ہم لوگوں کو بھول مت جانا۔ آتی جاتی رہنا۔'' ان کا انداز ویسا ہی شفقت بھرا تھا
روز اس نے محسوس کیا تھا۔

حیدر نے بھی مسکراتے ہوئے اسے خدا حافظ کہا۔ وہ اس قدر الجھی ہوئی اور ڈسٹرب تھی کہ چلتے و
دونوں کا شکریہ تک ادا نہیں کر سکی۔

جب اس نے گاڑی کو اس گھر سے دور ایک سڑک پر دوڑتے دیکھا تو اسے اچانک ہی اپنی بداخ
بدتمیزی کا خیال آیا۔ اسے ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ پتا نہیں وہ مینرز کب سیکھ پائے گی۔
درمیانی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا اور وہ اپنے باپ کے برابر میں پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ درمیان میں تو
تھے اور ان کے ایک طرف ام ایمن اور دوسری طرف الماس توفیق بیٹھی تھیں۔ وہ اپنے سگے باپ کے بر
اتنے تکلف سے اور دور ہٹ کر بیٹھی تھی جیسے وہ ایک غیر آدمی کے برابر میں بیٹھی ہو۔ وہ اس سے بے نیا
میں سارا وقت خاموش رہے تھے۔ ان کی اپنی بیوی کے ساتھ بھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ پتا نہیں وہ وا
ہی کم گو تھے یا صرف اس وقت خاموش تھے۔

وہ گھر اتنا عالیشان تھا' جتنا کراچی آنے کے بعد سے ان تمام گزرے دنوں میں اس نے اس کے بار
تصور کیا تھا۔ اس کا باپ ایک امیر آدمی ہے' یہ بات وہ کراچی آنے سے پہلے بھی جانتی تھی' لیکن وہ اتنا زیا
ہے' اس کے پاس پیسے کی اتنی زیادہ ریل پیل ہے' وہ اتنا زیادہ اثر و رسوخ رکھنے والا' ایک صاحب حیثی
معاشرے میں نہایت اعلا مرتبہ اور مقام رکھنے والا انسان ہے' یہ بات اسے یہاں آنے کے بعد ہی پتا چلی
مسعود اور اس کے باپ کے گھر میں ایک چیز مشترک تھی۔ وہ دونوں گھر بہت بڑے تھے' نہایت عالیشا
وہاں دنیا زمانے کی ہر سہولت اور ہر آسائش موجود تھی۔ وہ ان دونوں کے ساتھ گھر کے اندر آ گئی۔

وہاں کا فرنیچر قیمتی ہونے کے ساتھ ساتھ خوب صورت اور آرام دہ بھی نظر آ رہا تھا۔ تمام آرائشی اشیا
کی خوش ذوقی کا اعلان کر رہی تھیں۔ دیواروں پر لگی خوب صورت پینٹنگز مختلف کونوں میں نفاست سے

ڈیکوریشن پیس، ان ڈور پلانٹس، اس شاندار گھر میں وہاں کی قیمتی آرائش دیکھ رہی تھی۔

اتنا زیادہ امیر تھا ام ایمن کا باپ۔

وہ ام ایمن جس نے بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترستے ہوئے زندگی گزاری تھی۔ ماں کی مجبوری اور اپنی غربت سے سمجھوتا کرتے ہوئے اس نے بچپن میں بھی کبھی امی سے کوئی ضدیں اور فرمائشیں نہیں کی تھیں۔ لیکن اس کا دل چاہتا اچھے اچھے کھلونوں سے کھیلنے کو، بہت ساری چاکلیٹس اور آئس کریم کھانے کو، اچھے اچھے لباس پہننے کو، جیسا کھانا اسے کھانے کو ملا کرتا تھا اس سے اچھا کھانا تو اس کے باپ کے گھر کے نوکروں کو مل جایا کرتا ہوگا۔

اس احساس نے اس کے اندر بہت ساری تلخی بھردی۔

''ایمن کو اس کا کمرہ دکھا دو۔'' الماس توفیق نے سامنے کھڑی ملازمہ کو ہدایت کی توفیق کمال چند سیکنڈز پہلے ''میں سونے جا رہا ہوں۔'' کہتے ہوئے سٹنگ روم سے باہر چلے گئے تھے۔ ملازمہ نے ان کی بات پر سر ہلا کر اسے آئیے کہا۔

''میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر ضرور باتیں کرتی ایمن! لیکن اس وقت اتنی تھکن ہو رہی ہے اور اتنی سخت نیند آرہی ہے کہ میں تمہیں بالکل کمپنی نہیں دے پاؤں گی۔ تکلف بالکل مت کرنا۔ چائے، کافی جس بھی چیز کا موڈ ہو رشیدن سے کہہ دینا اور بھی کچھ چاہیے ہو تو اسے کہہ دینا۔ صبح انشاء اللہ تم سے باتیں ہوں گی۔'' ایک رسمی سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے انہوں نے اس سے معذرت چاہی۔ وہ جواباً کچھ کہے بغیر ملازمہ کے ساتھ اپنے کمرے میں آگئی۔

حیدر مسعود کے گھر میں جو کمرہ اسے ملا تھا، اسے وہ ایک عارضی ٹھکانا سمجھ کر استعمال کر رہی تھی۔ لیکن یہاں جو شاندار فرنیچر اور خوب صورت قالین، قیمتی پردوں سے آراستہ کمرہ اسے ملا یہ اب اس کا مستقل ٹھکانہ تھا۔ پھر جب وہ وضو کرنے باتھ روم میں آئی تو اس نے وہاں لگے اٹالین ٹائلز کی طرف خوب غور سے دیکھا۔ کیبنٹ میں قیمتی شیمپو، باڈی لوشن، باڈی اسپرے، ٹیلکم پاؤڈر، پرفیوم، ہر وہ امپورٹڈ چیز موجود تھی جس کا اس نے زندگی میں بھی کبھی تصور تک نہیں کیا تھا۔ حیدر مسعود کے گھر میں بھی یہی سب چیزیں موجود تھیں، لیکن وہ گھر اس کا نہیں تھا اور یہ گھر اور یہ کمرہ کیا یہ اس کے تھے؟ یہ اس کے تھے یا نہیں لیکن اسے اب رہنا تو یہیں تھا۔

نماز پڑھنے کے بعد وہ لائٹ بند کرکے سونے کے لیے لیٹ گئی۔ کل رات وہ باپ کی آمد کی ٹینشن میں نہیں سو پائی تھی اور آج؟ آج وہ پتا نہیں کیوں جاگ رہی تھی۔ پتا نہیں اسے رونا کیوں آرہا تھا۔ ساری رات وہ جاگتی اور روتی رہی تھی۔ ساری رات وہ اس انتظار میں رہی تھی کہ شاید اب وہ اس کے کمرے میں آئیں۔ جو باتیں انہوں نے اس سے فون پر نہیں کی تھیں، جو انہوں نے اس سے ملنے کے بعد نہیں کی تھیں اور جو انہیں کرنی چاہیے تھیں، شاید وہ اب اس کے کمرے میں آکر اس سے کریں۔ جو شخص کبھی اس کی زندگی میں تھا ہی نہیں، جس سے اس نے کبھی کوئی امیدیں وابستہ کی ہی نہیں تھیں، اس وقت وہ اس سے یہ امید کر رہی تھی کہ وہ اس کے پاس

آئے۔ اسے پیار کرے، اس سے باتیں کرے، اسے اس بات کا احساس دلائے کہ ماں کے مرجانے کے
دنیا میں تنہا نہیں ہوگئی۔

اس کا باپ ابھی زندہ ہے۔ کیا ہوا جو وہ پہلے اپنی کوئی ذمہ داریاں پوری نہیں کرسکا، وہ اب اپنی سب
کا ازالہ کردے گا۔ اپنی بچکانہ خواہشوں اور امیدوں پر رونے کے ساتھ ساتھ اسے غصہ بھی آرہا تھا۔
نے زندگی کے بیس سال کبھی پلٹ کر بیٹی کی خبر نہیں لی، اسے اب اچانک بیٹی سے محبت کس طرح ہوسکتی تھی

صبح ملازمہ نے دروازے پر دستک دے کر اسے ناشتے کا بلاوا دیا۔ وہ رات سوئی ہی نہیں تھی جو جاگ
سوال پیدا ہوتا۔ اپنا لباس بھی اس نے نماز پڑھنے کے بعد تبدیل کرلیا تھا۔ بال بھی بنا لیے تھے۔ وہ ملا
پیچھے پیچھے ڈائننگ روم میں آئی تو اس وسیع و عریض میز پر صرف توفیق کمال بیٹھے نظر آئے۔ وہ انہیں سلا
ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے سامنے میز پر اخبار پ
اور وہ ناشتہ کرنے کے ساتھ ساتھ اخبار پر بھی نظر ڈال رہے تھے۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے ٹوسٹ پر مکھن لگا رہی تھی۔ ان کے پیچھے وہ ان کے بارے میں چاہے
سوچتی ہو، لیکن آمنے سامنے بیٹھ کر ان کی رعب دار شخصیت کو دیکھتے ہوئے وہ سوائے ان کی رعب دار
مغرور شخصیت سے متاثر ہونے کے کچھ بھی سوچ نہیں پا رہی تھی۔ ان کی تصویریں اس نے بے شمار مرتبہ
تھیں۔ وہ تصویروں میں بہت ہینڈسم لگتے تھے، بہت زبردست، بہت شاندار۔ لیکن اب جب اس نے انہیں
سے دیکھا تو پتا چلا کہ وہ تصویروں میں تو اپنی اصل شخصیت کا دس فیصد بھی نہیں لگتے تھے۔

پچاس سال کی عمر میں اتنے زبردست اور ہینڈسم تھے کہ اسے یقین تھا کہ اب بھی کتنی ہی لڑکیوں
انہیں دیکھ کر تیز تیز دھڑکنے لگتے ہوں گے۔ ان کے سر میں سیاہ بالوں کے ساتھ ساتھ سفید بال بھی کافی
موجود تھے۔ یا شاید وہ جانتے تھے کہ یہ گرے بال ان کی شخصیت کے وقار میں کچھ اضافہ کرتے ہیں،
انہیں ڈائی نہیں کرتے تھے۔

ان کے شانے بہت چوڑے اور بالکل سیدھے تھے اور ان کا قد اسے یقین تھا کہ وہ کسی بھی طر
سے کم نہیں۔ اخبار پڑھتے ہوئے انہوں نے گلاسز لگا رکھے تھے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ گلاسز
زیادہ ہینڈسم لگتے ہیں یا ان کے بغیر۔

ان کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کا ذہن اپنی امی کی طرف چلا گیا۔ اس نے تصور میں امی کو ان کے
کرسی پر لا کر بٹھایا۔ ماں سے بہت سے زیادہ محبت کرنے کے باوجود اسے اس بات کا اعتراف کرنا
دونوں کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں تھا۔ اس کے تصور میں امی اسی حلیہ میں آئی تھیں جس میں وہ رہا کرتی
عام سے پرنٹ کا کوئی سستا سا سوٹ پہنے ہوئے، سر پر دوپٹہ اس طرح اوڑھا ہوا کہ اسے دونوں کا
پیچھے اڑسا ہوا ہو، پاؤں میں گھٹیا سی دو پٹی والی چپل، کسی بھی قسم کی جیولری اور میک اپ سے بے نیاز
میں اٹھنے بیٹھنے میں غرض یہ کہ ہر انداز میں احساس کمتری کی واضح جھلک۔ اعتماد سے محروم آنکھیں
حقیقت جتنی بھی تلخ تھی لیکن ام ایمن کو یہ بات تسلیم کرنی پڑی کہ اس کی ماں اس شخص کے ساتھ بالک

رہی تھی۔ یہ ایک بے جوڑ شادی تھی۔

اور اب اگر ام ایمن ماں کو ہٹا کر باپ کے ساتھ خود اپنا موازنہ کرتی تو بھی یہی جواب پاتی۔ وہ اس کے ساتھ اس کی بیٹی کے طور پر کھڑے ہو کر کبھی بھی جچ نہیں سکتی تھی۔ توفیق کمال آسمان تھے اور ام ایمن زمین تھی۔

وہ ناشتہ کر چکے تھے۔ چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر گلاسز اتارتے ہوئے انہوں نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ اسے دیکھا۔ وہ اتنی دیر سے انہیں چپکے چپکے دیکھنے میں مصروف تھی۔ انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے گھبرا کر جلدی سے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

''کیا پڑھ رہی ہو تم؟'' ان کی بھاری مردانہ آواز بے شک بہت خوب صورت تھی مگر وہ پھر بھی خائف ہو گئی۔ اس کی ہتھیلیوں پر نمی اتر آئی۔ تھوک نگلتے ہوئے بڑی مشکلوں سے اس نے انہیں جواب دیا۔

اس کی نگاہیں اپنے کپ پر جمی تھیں۔

''کس کالج سے؟''

وہ ان کی نظروں میں عزت پانے کے لیے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ بی اے کر رہی ہے یا کسی اچھے مضمون میں آنرز کر رہی ہے۔ اس نے ایک سیدھا سادہ بڑا عام سا بی اے کر رکھا تھا اور وہ بھی ایک بہت ہی چھوٹے کالج سے۔ انٹر میں اس کے مارکس کافی اچھے تھے' وہ اگر چاہتی تو کسی اچھے کالج سے بھی بی اے کر سکتی تھی۔ مگر اس نے جہاں سے انٹر کیا تھا' اسے وہی کالج گھر سے قریب پڑتا تھا۔ اس لیے اس نے وہیں سے ہی بی اے بھی کیا تھا۔

اس نے سر جھکائے بغیر ان کی طرف دیکھے ان کے دونوں سوالوں کے جواب دیے تھے۔ اس بے مثال ذہانت اور اعتماد رکھنے والے انسان کی نظروں میں عزت اور اہمیت پانے کے لیے وہ خود میں اچانک کانفیڈنس کہاں سے لے آتی۔ وہ ان کی طرف نہیں دیکھ سکتی' وہ اعتماد سے ان کے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔ اس کے پاس ایسی کوئی خوبی نہیں جس پر فخر محسوس کر کے وہ کہیں کہ ہاں ام ایمن واقعی میری بیٹی ہے۔ توفیق کمال کی بیٹی۔

''صرف اورنج جوس لا دو مجھے' تھوڑی دیر بعد اگر موڈ ہوا تو فروٹس لے لوں گی۔ کافی وزن بڑھا لیا ہے میں نے۔ اب کچھ دنوں تک کھانے میں بھی میں صرف بوائل سبزیاں' وائٹ میٹ اور براؤن بریڈ لوں گی۔'' اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ میز پر کب آ کر بیٹھی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ شاید ابھی ابھی ہی آئی تھیں ملازمہ کو اپنے ناشتے اور کھانے سے متعلق ہدایات دے رہی تھیں۔ ملازمہ سر ہلاتی کچن کی طرف چلی گئی۔

''ذرا سا ایکسرسائز اور سوئمنگ کرنے میں بے قاعدگی کیا آئی' میرا وزن ہی بڑھ گیا۔'' وہ اب توفیق کمال کی سے مخاطب تھیں۔ وہ جواباً کچھ نہیں بولے۔ شاید وہ کم بولنا پسند کرتے تھے۔

''نیند ٹھیک سے آ گئی تھی ایمن؟'' وہ مسکراتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئیں۔ وہ ان کے خود کو مخاطب کرنے سے پہلے بھی ان ہی کو دیکھ رہی تھی۔ سر اثبات میں ہلا کر انہیں جواب دے دیا اور اپنا چہرہ دوبارہ چائے کے کپ کی جانب کر لیا۔

''تم آفس دیر سے آؤ گی؟'' کرسی پر سے اٹھتے ہوئے انہوں نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔

''ہاں' آج میں آفس بارہ ساڑھے بارہ بجے تک آؤں گی۔ ابھی تیار ہوں گی' پھر مجھے مسز انور کے پاس جاتا ہے۔ اس کے بعد آفس آؤں گی تو دیر ہو ہی جائے گی۔'' ملازمہ الماس کے لیے جوس لے آئی تھی۔ اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے وہ ڈائننگ روم سے نکل گئے تھے جبکہ ان کے پیچھے پیچھے ایک ملازم ان کا بریف کیس ہاتھ میں لیے باہر نکلا تھا۔ الماس جوس کے سپ لیتے ہوئے اب اخبار دیکھنے لگی تھیں۔

تمام تر نفرتوں کے باوجود وہ یہ کڑوی سچائی تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہی تھی کہ توفیق کمال جیسے انسان کے ساتھ الماس توفیق جیسی حسین عورت ہی بجتی تھی۔ وہ اس کے باپ کی ہم عمر ہی ہوں گی لیکن اس عمر میں بھی انہوں نے خود کو کتنا مین ٹین کر کے رکھا ہوا تھا۔ ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر بجا طور پر کہا جا سکتا تھا کہ یہ ایک آئیڈیل جوڑا ہے۔ کتنی اچھی ہائٹ تھی ان کی۔ کتنا پرفیکٹ فگر تھا جسے یقیناً ایکسرسائز اور سوئمنگ کے ذریعے اس عمر میں بھی انہوں نے بہت اچھی طرح مین ٹین کر کے رکھا ہوا تھا۔ اس دراز قامت وجیہ مرد کے ساتھ چلتے ہوئے وہ یقیناً کسی بھی طرح اس سے کم نہیں لگتی ہوں گی۔ ان کے تراشیدہ سلکی بال کندھوں تک آ رہے تھے۔ اس وقت گلابی رنگ کے سادہ سے شلوار قمیص میں بغیر کسی میک اپ کے بھی وہ بے تحاشا حسین لگ رہی تھیں۔ وہ اپنا جوس کا گلاس پی لینے کے بعد اس سے معذرت کرتے ہوئے اٹھ کر لاؤنج سے چلی گئیں اور وہیں بیٹھی بے وجہ اس عورت کے ساتھ اپنی ماں کا موازنہ کیے چلی جا رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد وہ لاؤنج میں واپس آئیں تو وہ ان کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ کچھ دیر پہلے گلابی رنگ کے شلوار قمیص میں اگر وہ حسین لگ رہی تھیں تو اب اس آف وائٹ رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی میں بے تحاشا حسین۔ بغور دیکھنے پر پتا چل رہا تھا کہ انہوں نے میک اپ کیا ہوا ہے۔ ان کے ہونٹوں پر' ان کی آنکھوں پر جو رنگ بھی استعمال ہوئے تھے' وہ سب ان کے چہرے کا حصہ معلوم ہو رہے تھے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ انہوں نے الگ سے کوئی رنگ اپنے چہرے پر لگا رکھا ہے۔

ان کے گلے میں بس ایک ڈائمنڈ کا نیکلس تھا' کانوں میں چھوٹے چھوٹے ڈائمنڈ ہی کے ایئر رنگز' بائیں ہاتھ میں صرف گھڑی اور دائیں ہاتھ میں سونے کے دو کنگن۔ انگوٹھیاں ہاں انہوں نے چار پانچ پہن رکھی تھیں۔

''میں جا رہی ہوں ایمن۔ تم اکیلی بور ہونے لگو تو ڈرائیور گھر پر موجود ہے۔ جہاں دل چاہے اس کے ساتھ چلی جانا۔'' ایک رسمی سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے انہوں نے اس سے کہا اور پرس کندھے پر ڈالتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔

بے ساختہ ایک بچکانہ اور بے وقوفانہ خواہش اس کے دل میں ابھری۔ ''کاش میری امی اس عورت کے جیسی ہوتیں۔ پھر توفیق کمال انہیں کبھی نہیں چھوڑتے۔ پھر وہ دونوں ایک ساتھ رہتے اور پھر میں اپنے ماں باپ کے ساتھ زندگی گزارتی۔'' وہ اس بات پر حیران ہو رہی تھی کہ اپنی سوکن کی بیٹی سے وہ کس طرح اتنے مہذب اور خوش اخلاقی والے انداز میں مل رہی تھیں۔ یہ شاید ان بڑے لوگوں کی ایک اضافی خوبی تھی۔ دل میں یہ جس کسی کے لیے جو کچھ بھی رکھیں لیکن چہرے پر اسے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ ملازمہ نے آ کر ناشتہ کے تمام لوازمات ٹیبل پر سے سمیٹنے شروع کیے تو وہ اس کی خود پر پڑنے والی نظروں سے اکتا کر وہاں سے اٹھ گئی۔ اپنے مالک کی اچانک کہیں سے دریافت ہو جانے والی اس بیٹی کو سارے ہی ملازم کچھ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

وہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی اور پھر شام تک وہ اسی طرح اپنے کمرے ہی میں رہی تھی۔ ملازمہ نے اس سے دوپہر کے کھانے کے لیے پوچھا تھا لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ وہ مالکانہ انداز میں گھر میں چلنے پھرنے کے بجائے سارا وقت اپنے کمرے میں قید رہی تھی۔ پورا دن اس کا خاموشی سے گزرا تھا۔

مغرب سے کچھ پہلے وہ اپنے کمرے سے نکل کر بالکونی میں آ گئی تھی۔ اس کا کمرہ فرسٹ فلور پر تھا اور اس کے کمرے سے ملحق ایک بالکونی بھی تھی۔ وہ بالکونی میں کھلنے والا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ریلنگ پر بازو ٹکا کر وہ گہری سانسیں لیتے ہوئے شام کی ٹھنڈی ہوا کو اپنے اندر پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بالکونی سے پورچ کا کچھ حصہ اور لان تو تقریباً پورا کا پورا بڑا واضح نظر آ رہا تھا۔ لان میں چاروں طرف نظر آتی ہریالی اسے کچھ پل کو ہی سہی لیکن سکون پہنچانے لگی تھی۔

پورچ میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز پر اس نے اس سمت دیکھا۔ توفیق کمال ڈرائیونگ سیٹ سے اترتے نظر آئے۔ ایک ملازم بھاگا بھاگا ان کے پاس پہنچا تھا۔ وہ اس پر نظر ڈالے بغیر آگے بڑھ گئے جبکہ وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر سے ان کا بریف کیس اور کوٹ نکالنے لگا تھا۔ وہ بالکونی میں کافی دیر تک یونہی کھڑی رہی۔ کتنی دیر تک اسے ایسا لگتا رہا کہ شاید وہ اس کے کمرے میں آئیں یا شاید اسے اپنے کمرے میں بلوائیں۔ یونہی اس کی خیر خیریت پوچھنے۔ مگر جب رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے اور ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تو اسے اپنی خوش فہمیوں پر ہنسی آئی۔ زندگی کے بائیس سال اگر اس نے اپنی ماں کے ابنارمل رویوں کے ساتھ الجھتے ہوئے گزارے تھے تو اب بقیہ تمام سال ایک پتھر کو اپنے باپ کے روپ میں دیکھتے ہوئے گزارنے تھے۔

* * *

ملازمہ اسے بلانے آئی تو ڈائننگ روم میں قدم رکھتے ہی اسے وہاں کچھ اضافی آوازیں سنائی دیں۔

''آؤ ایمن یہ'' الماس نے مسکراتے ہوئے یہ بات اس سے اردو میں کہی' ان کے دونوں مہمان غیر ملکی تھے۔

''یہ میری بیٹی ہے ام ایمن۔'' وہ میز کے قریب پہنچی تو توفیق کمال نے اس کا اپنے مہمانوں سے تعارف کروایا۔

ان دونوں نے مسکرا کر اسے ہیلو کہا۔ وہ جواباً ہیلو کہتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئی' کھانے کی میز پر بہت شاندار دعوتی اہتمام تھا۔ وہ شاید ان کے کوئی کاروباری دوست تھے کیونکہ توفیق کمال اور ان صاحب کے درمیان ہونے والی گفتگو کاروباری نوعیت اور بڑی پرتکلف قسم کی تھی۔ اس میں بے تکلفی کا کوئی انداز شامل نہیں تھا۔ الماس انہیں اور ان کی بیگم کو ایک اچھے میزبان کی طرح مختلف ڈشز پیش کر رہی تھیں۔

اس نے دل ہی دل میں اس بات پر شکر ادا کیا کہ وہ حیدر کے ساتھ اس شاندار ہوٹل میں ڈنر کر آئی تھی۔ اس طرح کے پرتکلف ڈنرز میں کس طرح کے مینرز کا خیال رکھنا پڑتا ہے وہ اس ہوٹل میں جانے سے پہلے بھی یہ بات جانتی تھی لیکن خالی کتابوں میں پڑھنے اور خود عمل کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے' اگر وہ اس روز اس کے ساتھ ڈنر کرنے نہ گئی ہوتی تو اس وقت اسے کافی مشکل پیش آتی۔ اس نے تکلفاً اپنی پلیٹ میں ایک دو چیزیں ڈال لی تھیں اور آہستہ آہستہ انہیں کھانا شروع کر دیا تھا۔

''اور آپ کیا کرتی ہیں' ابھی تو یقیناً پڑھ ہی رہی ہوں گی؟'' وہ چائنیز دوست اچانک اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ وہ اتنی دیر سے ان لوگوں کو آپس میں مصروف دیکھ کر مطمئن سے انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ یوں براہِ راست اس سے مخاطب ہوں گے۔

''میں نے گریجویشن کیا ہے۔'' بمشکل وہ یہ جملہ بول پائی۔ اس کی انگریزی لکھنے' پڑھنے کی حد تک تو اچھی تھی مگر بولتے ہوئے ایک جھجک سی محسوس ہوا کرتی تھی۔

مگر یہاں ان غیر ملکیوں کے ساتھ انگریزی میں اعتماد کے ساتھ بات کرنا اس کے لیے بالکل ناممکن کام تھا۔ اسے رہ رہ کر اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ ڈائننگ روم میں آنے سے پہلے ہی اسے کیوں نہیں پتا چل گیا کہ آج اس کے باپ کے کچھ غیر ملکی مہمان مدعو ہیں۔

''آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟'' وہ یقیناً اخلاقی تقاضے نبھانے کے لیے اس کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے مگر وہ اپنی گھبراہٹ پر کس طرح قابو پاتی۔

توفیق کمال کے غیر ملکی مہمان نے حیرانی سے اس کی گھبراہٹ کو دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسی طرح گھبرائے اور پریشان ہوتے ہوئے ان کے سوال کا کوئی جواب دینے کی کوشش کرتی توفیق کمال نے بڑی مہارت سے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔

''ابھی تو اس نے گریجویشن کیا ہے۔ آگے دیکھیں اس کا کیا موڈ بنتا ہے۔''

الماس نے ان کی بیگم کو جو ایمن کو تعجب سے دیکھ رہی تھیں' اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس کا تیز تیز دھڑکتا دل اب جیسے بالکل رک چکا تھا۔ جس بات سے وہ ڈر رہی تھی وہ ہو چکی تھی۔ باقی سارے وقت توفیق کمال اور الماس نے اپنے مہمانوں کو باتوں میں اس طرح مصروف رکھا تھا کہ وہ ایک پل کے لیے بھی ایمن کے بارے میں کچھ سوچنے یا حیران ہو کر اسے دیکھنے کے لیے وقت نہیں نکال سکے تھے۔

ان لوگوں کے اٹھتے ہی وہ بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں بڑی تیزی سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جو کچھ ہوا وہ نہیں ہونا چاہیے تھا جس طرح اس کے باپ نے اس کی ماں قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اب اسی طرح اسے بھی رد کر دیں گے۔

باپ کی نظروں میں کچھ تھوڑی بہت عزت یا اہمیت پانے سے پہلے ہی وہ سب کچھ غلط کر آئی تھی۔ وہ واقع صرف شکل و صورت میں ہی نہیں بلکہ اپنے ہر انداز میں اپنی ماں جیسی تھی۔

روتے روتے پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور پھر صبح فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اٹھتے ساتھ ہی اسے کل رات کا سارا واقعہ ایک دفعہ پھر یاد آ گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر نماز پڑھی۔ پتا نہیں کیوں اسے بھی رونا آئے چلا جا رہا تھا۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی روتی رہی۔ یہاں اسے گلے لگا کر پیار کرنے والا کوئی نہیں تھا

''تم رو کیوں رہی ہو ایمن؟'' یہ پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے اپنے آنسو خود ہی صاف کرنے تھے نے خود ہی انہیں صاف کر لیا تھا۔ ناشتے کے لیے بلائے جانے پر اس کا دل چاہا کہ وہ منع کر دے۔ اس میں

کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ ان کی آنکھوں میں لکھا یہ جملہ کیسے پڑھ پائے گی۔ ”میں تمہیں قبول نہیں کرتا ایمن۔ تم میری بیٹی کیسے ہو سکتی ہو۔ تم صرف زینب بشیر کی بیٹی ہو۔“ لیکن اسے باہر تو نکلنا تھا۔

وہ مردہ قدموں سے خود کو گھسیٹتے ہوئے ڈائننگ روم میں آ گئی۔ آج ناشتے کی میز پر توفیق کمال کے ساتھ الماس بھی موجود تھیں۔ وہ کل کی طرح اخبار پر نظریں دوڑاتے ہوئے ناشتہ کر رہے تھے۔ الماس ڈائٹنگ پر تھیں اس لیے وہ فریش فروٹس سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ اسے کچھ کھانے کی خواہش ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے لیے کپ میں تھوڑی سی چائے ڈال لی تھی۔ ٹیبل پر نظریں جمائے وہ چائے کے گھونٹ حلق سے اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ناشتہ ختم کر چکے تو اخبار دور ہٹاتے ہوئے انہوں نے آنکھوں پر سے گلاسز اتارے۔

”آج ڈرائیور کے ساتھ جا کر اپنے لیے کپڑے خرید لینا۔“ انہوں نے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی طرف بڑھائی۔ ان کا لہجہ ویسا ہی سپاٹ تھا جیسا کل صبح اس سے ناشتے کی میز پر بات کرتے ہوئے تھا۔ اس میں نہ محبت تھی نہ نفرت، نہ غصہ نہ ناراضی۔ اس میں کسی بھی طرح کے جذبات تھے ہی نہیں۔ الماس اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ تھیں۔ وہ نہ ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھیں اور نہ انہوں نے اس بارے میں کوئی تبصرہ کیا تھا۔

”مجھے آپ کے پیسے نہیں چاہئیں۔ آپ اپنے پیسے اپنے پاس رکھیں۔“ پیٹھ پیچھے وہ ان کے لیے اس طرح کے جملے سوچ سکتی تھی مگر منہ پر بولنے کا تو وہ مر کر بھی تصور نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اسی طرح ان سے نظریں ملائے بغیر وہ ڈھیر سارے نوٹ ہاتھ میں لے لیے۔ کل رات صرف اس کے اعتماد سے عاری چہرے اور اس کے اٹکتے گھبراتے بے وقوفانہ انداز ہی نے نہیں بلکہ اس کے لباس نے بھی انہیں ان کے مہمان کے سامنے شرمندہ کروایا تھا۔ وہ میز پر سے اٹھ کر جا چکے تھے۔ چند منٹوں بعد الماس بھی چلی گئیں۔

وہ دونوں آفس جا چکے تھے اور وہ نوٹوں کی گڈی ہاتھوں میں لیے خاموش بیٹھی تھی۔ کاش وہ بی بی کے کہنے پر ان کے ساتھ شاپنگ کرنے چلی گئی ہوتی۔ کاش وہ حیدر کے ساتھ بازار جانے پر اپنے لیے کچھ اچھے ڈریسز خرید چکی ہوتی۔ اس وقت وہ پیسے استعمال کرنا اس کی غیرت اور انا کو گوارا نہیں تھا۔ وہ طنزیہ انداز میں خود پر ہنسی۔

وہ اس شخص کے گھر میں رہ سکتی ہے، اس کے گھر میں کھا پی سکتی ہے لیکن وہ اس گھر کے مالک کے پیسوں کو خرچ نہیں کر سکتی۔ اگر وہ اتنی ہی انا اور غیرت والی ہے تو اسے اس گھر میں رہنا بھی نہیں چاہیے۔ یہاں کھانا پینا بھی نہیں چاہیے۔ اسے اپنا ٹھکانہ کہیں اور ڈھونڈ لینا چاہیے اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تو پھر اسے اس نام نہاد انا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لے دفن کر دینا چاہیے۔ اسے یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ وہ اسے یہاں بلانے کے لیے نہیں تڑپ رہے تھے، اس کی ماں نے ان سے التجائیں کر کے انہیں بیٹی کو اپنے پاس بلانے کے لیے کہا تھا۔

یہ اس کے پاس آخری ٹھکانہ تھا۔ اس کے بعد ساری دنیا میں اس کے لیے کوئی پناہ گاہ نہیں تھی اور جب اسے یہاں رہنا تھا تو پھر اسی طرح رہنا چاہیے تھا جیسے کہ اس گھر کا مالک چاہتا تھا۔

وہ ڈرائیور کے ساتھ اسی بوتیک میں آ گئی جہاں اس دن حیدر لے کر آیا تھا۔ اس نے نہ رنگوں پر دھیان دیا اور نہ کپڑوں کے اسٹائل پر، بغیر سوچے سمجھے اور پسند کیے اس نے دس بارہ ڈریسز خرید لیے تھے۔ گھر واپس آ کر

اس نے وہ سارے شاپنگ بیگز بیڈ پر الٹ دیے۔ اس نے نیلے رنگ کے چار ڈریسز خرید لیے تھے، گرین اور وائٹ ڈریس صرف رنگوں کی وجہ سے مختلف تھے ورنہ ان پر کڑھائی ایک جیسی کی ہوئی تھی۔ تب ہی سیلز گرل اور وہاں پر خریداری کرنے آئی ہوئی ایک خاتون اسے اتنے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ کیا پتا وہ دونوں اسے نفسیاتی مریضہ سمجھ رہی ہوں۔ وہ ایک ایک کر کے الماری میں اپنے سارے قیمتی ڈریسز لٹکانے لگی۔

اس نے ان کے مہمانوں کے سامنے آنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ انہیں اپنی وجہ سے مزید کسی شرمندگی سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ناشتے پر البتہ اس کی ان سے روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ وہ اپنے قیمتی ڈریسز میں سے کوئی لباس پہن کر ہی ان کے سامنے جاتی۔ وہ انہیں سلام کرتی، وہ جواب دے دیتے۔ وہ کھانے کے دوران خاموش رہتے پھر ناشتہ ختم کرنے کے بعد اس سے ”پیسے تو نہیں چاہئیں، کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے“ جیسے مختصر سے سوال کرتے وہ انکار میں سر ہلا دیتی اور وہ میز پر سے اٹھ جاتے۔ ان کے مہینے میں پندرہ دن اگر کراچی میں گزرتے تھے تو باقی پندرہ دن کراچی سے باہر۔ اس عمر میں بھی ان کی صحت قابلِ رشک تھی اور وہ مسلسل سفر کرنے سے بالکل نہیں تھکتے تھے۔ اگر کسی صبح لمبی فلائٹ پر سفر کر کے کراچی پہنچے ہوتے تو بھی آفس جانے کے لیے اپنے وقت پر تیار ہو جاتے۔ جب وہ موجود نہیں ہوتے تو پھر وہ ناشتے اور کھانے کے لیے بھی اپنے کمرے سے نہیں نکلتی تھی۔ الماس کے ساتھ نہ اس کا کوئی واسطہ تھا اور نہ اسے کوئی واسطہ رکھنا تھا۔ اب اس نے یہ سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ الماس اس سے نفرت کیوں نہیں کرتیں۔ اسے اپنے سارے سوالوں کے جواب خود بخود ہی مل گئے تھے۔ اس بے چاری قسم کی ام ایمن سے نفرت اور دشمنی پال کر آخر وہ کرتیں بھی کیا۔

* * *

وہ حسبِ عادت شام کو بالکونی میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ چھٹی کا دن تھا، اس لیے آج وہ سارا دن اپنے کمرے میں رہی تھی۔ توفیق کمال کسی سیمینار میں شرکت کے لیے ملائیشیا گئے ہوئے تھے۔ وہ ٹھنڈی اور خوشگوار سی ہوا کو محسوس کرتے ہوئے ریلنگ پر کہنیاں ٹکا کر لان کی طرف متوجہ ہوئی تو اسے لان چیئرز پر الماس اور حیدر بیٹھے نظر آئے۔

ان دونوں کے بات کرنے کے انداز میں کافی زیادہ بے تکلفی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ حیدر نے الماس، توفیق کا ذکر کرتے ہوئے انہیں الماس آپی کہا تھا اور پھر وہ ان کے ساتھ اپنے قریبی تعلق کی نوعیت بتاتے ہوئے اچانک خاموش ہو گیا تھا۔ کیا وہ دونوں آپس میں کزنز تھے؟ وہ ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے یہی سوچ رہی تھی کہ اچانک حیدر نے سر اٹھا کر بالکونی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹی اور پھر تیزی سے واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ رشیدہ اسے کھانے کے لیے بلانے آئی تو اس کے پوچھے بغیر خود ہی اسے بتا دیا کہ کھانے پر ایک مہمان بھی موجود ہیں۔ وہ اب اس کے پوچھے بغیر ہی اسے اس بات سے آگاہ کر دیا کرتی تھی۔

”کون حیدر مسعود؟“ اس کے استفسار پر اس نے سر ہلا دیا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ توفیق کمال کی عدم موجودگی میں تو اسے کھانے کی میز پر ویسے ہی نہیں جانا تھا۔ وہ

اب بیڈ پر بیٹھی یہ سوچ رہی تھی کہ رشیدہ نے ڈائننگ روم میں جا کر ان دونوں کو اس کے کھانے سے انکار کے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ اتنی دیر سے اگر وہ ان دونوں کے درمیان موضوع گفتگو نہیں بنی تھی تو اب ضرور بنے گی۔

وہ تو ہر بات سے واقف تھا۔ وہ توفیق کمال اور الماس توفیق کے انتہائی قریبی افراد میں شامل تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے باپ کے لیے امریکہ اپنے بیٹے کی دلجوئی کرنے کے لیے جانا ضروری ہے بہ نسبت اس بات کے کہ اپنی بیٹی کو خود جا کر اپنے گھر لے آئے۔ پتا نہیں وہ ہر ایک کے لیے اتنا ہمدردانہ انداز رکھتا تھا یا صرف اسے ام ایمن پر ہی ترس آ گیا تھا لیکن نہیں وہ ہر ایک کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش نہیں آتا تھا۔ اسے ہوٹل میں ملنے والی وہ خوب صورت لڑکی یاد آئی جس کے ساتھ اس نے بڑا روڈ انداز اختیار کیا تھا۔

وہ توفیق کمال کی بیٹی تھی' اس بات سے بہت زیادہ بڑھ کر وہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا۔

جب وہاں رہ رہی تھی تو حیران ہونے کے باوجود اسے اس کا رویہ اچھا لگتا تھا۔ اس کی باتیں اور اس کا انداز اچھا لگتا تھا لیکن اب وہ سنجیدگی سے یہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ ایسا کیوں تھا؟ کیا اسے اس مجبور اور بے سہارا لڑکی پر اس پہلی رات اتنا زیادہ رحم آیا تھا کہ پھر آنے والے تمام دنوں میں وہ اس کے ساتھ غیر معمولی سلوک کرتا رہا؟

* * *

اس صبح ناشتے کی میز پر انہوں نے اس سے ''وعلیکم السلام'' اور ''کسی چیز کی ضرورت تو نہیں' پیسے تو نہیں چاہئیں'' والی معمول کی باتوں کے بعد ایک اضافی بات کی۔

''تم کمپیوٹر کا کوئی کورس کیوں نہیں کر لیتیں۔'' اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''سارا دن گھر پر فارغ رہتی ہو۔ بہتر ہے اپنے لیے کوئی اچھی مصروفیت ڈھونڈ لو۔ انگلش لینگویج وغیرہ کا بھی کورس کر سکتی ہو۔'' انہوں نے سنجیدگی سے اسے مشورہ دیا۔ الماس اس گفتگو کے دوران بالکل لاتعلق نظر آ رہی تھیں۔

اسے یہ مشورہ دینے کے بعد انہوں نے اگلے ہی روز اس کے کمرے میں کمپیوٹر رکھوا دیا تھا۔ وہ دو ملازمین کو کارٹنز اٹھا کر اپنے کمرے میں لاتا دیکھ کر ایک پل کو حیران ہوئی پھر اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کے لیے بالکل نیا کمپیوٹر منگوایا گیا ہے۔ پینٹیم فور' پرنٹر اور دیگر تمام لوازمات کے ساتھ۔ اب اسے اپنے کمرے میں کتابیں پڑھنے اور ٹی وی دیکھنے کے علاوہ بھی ایک مصروفیت مل گئی تھی۔

اس نے کہیں سے باقاعدہ کمپیوٹر کا کورس نہیں کیا تھا لیکن زینت خالہ کے گھر پر عارف بھائی اور گڑیا کو دیکھ دیکھ کر وہ کافی کچھ سیکھ گئی تھی۔ اسے انٹرنیٹ کا بھی تھوڑا بہت استعمال آتا تھا۔ اب سارے دن کی فراغت کے ساتھ اپنے ہاتھ میں کمپیوٹر آیا تو وہ خود ہی اس میں بہت سی نئی چیزیں سیکھنے لگی۔

وہ باپ کے مشورے کو بھولی نہیں تھی لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس انسٹی ٹیوٹ سے کمپیوٹر کا کورس کرنا چاہیے۔ اس نے اخبار سے مدد لینی چاہی تو اسے اس میں بہت سے انسٹی ٹیوٹ کے خوبیوں سے بھرے ہوئے اشتہار نظر آئے۔ ہر اشتہار کو دیکھ کر لگتا کہ یہی انسٹی ٹیوٹ سب سے اچھا ہے۔ وہ کنفیوز ہو گئی تھی۔ وہ سوچ سمجھ کر کسی اچھی جگہ سے کورس کرنا چاہتی تھی تاکہ باپ کی نظروں میں کچھ تو سرخرو ہو سکے۔

* * *

وہ لان میں واک کر رہی تھی۔ ابھی پانچ بجے تھے اور الماس ساڑھے پانچ بجے سے پہلے آفس سے نہیں آتی تھیں۔ موسم آج صبح ہی سے بہت اچھا تھا۔ سارا دن دھوپ نہیں نکلی تھی۔ بس یوں لگتا رہا تھا کہ جیسے بارش ہونے والی ہے۔ پھول توڑنا اسے بچپن میں بھی بہت ظالمانہ کام لگا کرتا تھا اور اب بھی وہ ایسی ہی تھی۔ وہ بس پھولوں کو دیکھتی اور ان کی خوب صورتی کو سراہتی رہی تھی۔ اسے چوکیدار کے گیٹ کھولنے کی آواز آئی تو وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ آج الماس اپنے وقت سے پہلے آ گئی تھیں۔ وہ ان سے ملنے اور بات چیت کرنے سے بچنے کی خاطر تیزی سے وسیع و عریض لان کو عبور کرتی آگے بڑھی لیکن تب تک پورچ میں گاڑی آ کر رک چکی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر پورچ کی طرف دیکھا تو وہاں ایک نہیں دو گاڑیاں آگے پیچھے آ کر رکی تھیں۔ آگے والی گاڑی میں سے توفیق کمال اترے تھے اور پیچھے والی میں سے حیدر مسعود۔ وہ باپ کو دیکھ لینے کے بعد اب سیدھی اندر نہیں جا سکتی تھی۔ وہ دونوں اسے دیکھ چکے تھے۔ اس نے رک کر ان کے قریب آنے کا انتظار کیا۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔'' سلام کا جواب ان دونوں نے دیا تھا۔ توفیق کمال کا جواب ویسا ہی سرد اور سپاٹ سا تھا جب کہ حیدر کے جواب میں گرم جوشی موجود تھی۔ توفیق کمال بغیر رکے دروازہ کھول کر ''آؤ حیدر'' کہتے ہو اندر داخل ہو گئے جب کہ حیدر نے اسے پہلے اندر جانے کا موقع دیا تھا۔

''کیسی ہو بے مروت لڑکی؟ اپنے پاپا کے گھر میں آ کر بھول گئیں نا ہمیں۔'' اس کا لہجہ ویسا ہی اپنائیت بھ اور دوستانہ تھا۔ مسکراتے ہوئے وہ اس سے شکوہ کر رہا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ دونوں سٹنگ روم میں آ چکے تھے۔ توفیق کمال صوفے کے پاس کھڑے حیدر کا انتظار کر رہے تھے۔

''کل ڈنر ہے گھر پر' امریکہ سے ہمارے بزنس فرینڈ اپنی فیملی کے ساتھ کراچی آئے ہوئے ہیں۔ انہیں او اپنے دو چار خاص خاص جاننے والوں کو ڈنر پر انوائیٹ کیا ہے میں نے' ویسے تو میں توفیق بھائی سے بھی تمہیں لانے کو کہہ چکا تھا لیکن اب تم مل گئی ہو تو تمہیں خاص طور پر تاکید کر رہا ہوں۔ ضرور آنا' مجھے اور بی بی کو بہت اچ لگے گا۔'' اس نے ایک نظر حیدر کو اور پھر توفیق کمال کو دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح ان کا چہرہ بے تاثر تھا۔ اس کے جوا میں کچھ کہنے سے پہلے ہی دین محمد ہاتھوں میں چار پانچ فائلیں اور ان کا بریف کیس اٹھائے اندر داخل ہوا۔ دی محمد نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا۔ شاید وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ فائلیں کہاں رکھنی ہیں۔

''کہاں بیٹھو گے حیدر؟'' انہوں نے حیدر کو مخاطب کیا۔

''اسٹڈی میں بیٹھ جاتے ہیں۔'' وہ جواباً بولا۔ دین محمد کے بروقت آ جانے سے یہ ہوا تھا کہ وہ جواب دی کی زحمت سے بچ گئی تھی۔ ''ان دونوں کو ساتھ بیٹھ کر کاروباری معاملات ڈسکس کرنے ہیں۔'' وہ فائلوں کو دیکھ ک اندازہ لگاتے ہوئے ان دونوں سے پہلے ہی سٹنگ روم سے نکل گئی تھی۔

* * *

”صاحب نے کہا ہے نو بجے چلنا ہے۔ آپ تیار ہو جائیں۔“ وہ کمپیوٹر کے آگے بیٹھی تھی جب رشی اسے آ کر یہ پیغام دیا۔ وہ رشیدہ کو منع کرنے کے لیے کہتے کہتے رک گئی۔

”وہ کہاں ہیں؟“ وہ ابھی تک یہ بھی طے نہیں کر پائی تھی کہ انہیں کیا کہہ کر بلایا کرے۔

”اپنے کمرے میں ہیں۔“ رشیدہ اسے جواب دے کر کمرے سے چلی گئی تو وہ خود بھی کرسی سے اٹھ آج پہلی مرتبہ ان کے کمرے میں جا رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے اس نے دروازے پر دستک دی۔

”یس کم ان۔“ اندر سے فوراً ہی جواب موصول ہوا تو وہ کچھ خوفزدہ سی دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ وہ ٹانگیں پھیلا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ یقیناً اس وقت وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ انہوں نے اسے دیکھا۔

”بیٹھو۔“ انہوں نے سامنے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ جو بات کہنے آئی تھی اس کے لیے بیٹھنے ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے وہ جلدی سے بولی۔

”میرا ڈنر پر جانے کا موڈ نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ سوچتی اور ڈرتی ہوئی آئی تھی کہ اگر انہوں نے ”کیوں کیا“ جیسے سوالات کیے تو جواب دے گی لیکن انہوں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ شاید خود بھی نہیں چا تھے کہ وہ ان کے ساتھ جائے۔

رات گئے تک وہ انٹرنیٹ کنکٹ کیے بیٹھی رہی تھی۔ کھانے کا اس کا موڈ نہیں تھا، ہاں رشیدہ سے ایک چائے منگوا کر اس نے ضرور پی لی تھی۔ صبح ناشتے کی میز پر سارا منظر معمول کے مطابق تھا۔ ان دونوں کے جا کے بعد کافی دیر تک وہ بیٹھی اخبار پڑھا کرتی تھی اور اس وقت بھی ایسا ہی کر رہی تھی۔

”حیدر صاحب کا فون ہے۔“ دین محمد نے اسے آ کر اطلاع دی۔

”تم نے انہیں بتایا نہیں کہ......“

”جی میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ صاحب اور بیگم صاحبہ آفس کے لیے نکل گئے ہیں لیکن انہیں آپ بات کرنی ہے۔“ وہ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بولا۔

حیدر کو اس سے کیا بات کرنی تھی اور کیوں؟ اور وہ الماس توفیق کے کسی رشتے دار سے جو بلاوجہ اس پر تر کھاتا ہے کیوں بات کرے۔ وہ چڑ سی گئی تھی لیکن ملازم سے اس بارے میں کچھ کہنا اسے مناسب نہیں لگا لیے کرسی سے اٹھ گئی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے ریسیور اٹھایا۔

”وعلیکم السلام۔“ دوسری طرف سے بڑے غصے میں جواب آیا تھا۔

”کہاں تھیں تم کل؟ میں نے کتنے خلوص سے تمہیں انوائٹ کیا تھا اور تم......“ اس نے غصے میں اپنا جم ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وہ دل میں چڑنے اور اس بے تکلفانہ انداز میں باز پرس کرنے پر غصہ میں آنے کے باوج اس کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ اسے سب سے معقول بہانہ یہی سوجھا تھا۔

”کیا طبیعت خراب ہوئی ہے آپ کی ذرا میں بھی تو سنوں۔“ اس کے لہجے میں غصے کے ساتھ سا بھی شامل ہو گیا تھا۔

”وہ میرے سر میں......“ اس نے اٹکتے ہوئے بولنا شروع کیا ہی تھا کہ اس نے بڑی خفگی سے اس کاٹ دی۔

”بلاوجہ جھوٹ مت بولو۔ تم کل جان بوجھ کر نہیں آئیں اور یہ بات سن لو کہ تمہارے نہ آنے کو میں مائنڈ کیا ہے اور صرف میں نے ہی نہیں بی بی نے بھی برا مانا ہے۔ تمہیں ہوا کیا ہے میری یہ سمجھ میں نہیں ہمارے پاس سے تو اچھی خاصی آئی تھیں۔ توفیق بھائی کے پاس آ کر نجانے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اس بجائے اس کے کہ مجھے دیکھ کر لان میں آ جاتیں میری شکل دیکھتے ہی چلی گئیں۔ کھانا بھی ساتھ بیٹھ کر نہ میں اس روز تمہارے گھر پر مہمان تھا ناں کیا مہمانوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جاتا ہے اور ہمارے پاس مہمان تھیں تو ہم نے تمہارے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا؟“ وہ بڑی اپنائیت سے شکوہ کر رہا

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے جواب میں کیا کہنا چاہیے۔ وہ اتنی اہم نہیں تھی کہ اس کے نہ جانے سے کسی کو کوئی فرق پڑا ہو پھر وہ کیوں اس طرح بات کر رہا تھا۔ شاید ابھی ابھی وہ اپنے آفس پہنچا ہو گا اور آ ہی اس نے سب سے پہلے اسے فون کیا تھا۔ ام ایمن کو لیکن کیوں؟

”آئی ایم سوری۔“ وہ اتنے سارے شکوؤں کے جواب میں سوری کے علاوہ کچھ نہ بول سکی۔

”صرف سوری سے میری ناراضی دور نہیں ہو سکتی۔ تم مجھے وجہ بتاؤ اپنے نہ آنے کی بھی اور اس روز کرنے کی بھی۔“ کتنے سارے دنوں بعد کوئی اسے بولنے کا موقع دے رہا تھا۔ کوئی تھا جو اسے سننا چا وہ اس سے کیا کہے۔ وہ اس شخص کے سامنے اب کوئی بھی تماشا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جواباً خاموش رہی اس کی آنکھوں میں اچانک ہی ڈھیر سارے آنسو آ گئے تھے۔

”ام ایمن! کیا ہوا ہے؟ تم خاموش کیوں ہو؟“ وہ اس کی خاموشی سے تنگ آ کر بولا۔ اس نے کہے بغیر ایک دم ریسیور کریڈل پر رکھ دیا تھا۔ وہ وہیں کھڑی ہوئی بری طرح رو رہی تھی۔ وہ ایسے کیو ہے؟ وہ اسے اتنی اہمیت کیوں دیتا ہے؟

وہ اس کے بارے میں چاہے جتنی بھی منفی باتیں سوچ لے لیکن جب وہ اس سے مخاطب ہوتا اپنائیت بھرا، پُرخلوص انداز اسے ہر بات بھلا دیتا ہے۔ اچانک ہی دل چاہنے لگتا ہے کہ اس شخص پر اعتبا سے دل میں موجود ساری باتیں کہہ دو۔

فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو وہ اس یقین کے ساتھ کہ کال اس نے ر جلدی سے بولا۔

”تم رو رہی ہو؟ لیکن میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا جو تمہیں رلائے۔“

”آپ نے اپنے گھر پر میرے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا تھا تو اس کے لیے وہ لوگ آپ کے شکر گزار ہوں جن کی وجہ سے وہ برتاؤ کیا گیا تھا اور پھر بھی اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں ذاتی طور پر آپ کا شکریہ ادا کروں تو ٹھیک ہے میں کر دیتی ہوں آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے اپنے گھر پر میرا بہت خیال رکھا۔ مجھے بہت زیادہ ٹائم دیا۔ مجھ پر ترس کھا کر ہی سہی لیکن گھنٹوں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کیں۔ اپنا قیمتی وقت میرے لیے برباد کیا۔ بس ٹھیک ہے کر دیا میں نے آپ کا شکریہ ادا۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”اب آپ مجھے فون مت کیجیے گا۔ مجھے آپ سے بات نہیں کرنی۔“ اس نے اسی طرح روتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ نوکروں میں سے کوئی اسے روتا ہوا دیکھے۔ کافی دیر تک رونے کے بعد وہ خود ہی چپ ہو گئی تو اپنی کچھ دیر پہلے کی گفتگو کو یاد کر کے پچھتانے لگی۔ اسے کیا ہو گیا تھا۔ اسے حیدر مسعود کے ساتھ اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔

رات کے کھانے کے فوراً بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ آج صبح والی بات سے وہ اتنی زیادہ مضطرب تھی کہ نہ اس کا ٹی وی دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا نہ کتاب پڑھنے کو اور نہ کمپیوٹر آن کرنے کو۔ وہ بالکل فارغ بیٹھی ہوئی تھی جب رشیدہ دروازہ تھپتھپا کے اندر آئی اور اسے حیدر اور بی بی کی آمد کے بارے میں بتایا۔

”وہ لوگ لاؤنج میں بیٹھے ہیں۔ صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔“ صبح جس طرح اس نے حیدر سے بات کی تھی اس کے بعد اس وقت وہ اس کا سامنا کس طرح کرے گی۔

”السلام علیکم۔“ وہ لاؤنج میں آ گئی تھی۔ بی بی نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ ”میں پچھلے دنوں دبئی گئی تھی۔ وہاں سے اپنے سب قریبی جاننے والوں کے لیے کچھ چھوٹے موٹے تحفے بھی لائی تھی۔ تمہارے لیے بھی یہ ایک دو چیزیں خریدی تھیں، میں نے سوچا تھا کہ کل تم آؤ گی تو یہ تمہیں دے دوں گی۔ اب تم تو کل آئیں نہیں۔ اس لیے آج مجھے خود ہی یہ دینے کے لیے تمہارے پاس آنا پڑا۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پلاسٹک بیگ پکڑایا۔ وہ تحفہ قبول کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ اس کی نظر اپنے باپ پر پڑی تو ان کی آنکھوں میں تحفہ قبول کر لینے کی ہدایت نظر آئی۔

”تھینک یو۔“ اس نے وہ بیگ ان کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ الماس اور حیدر آپس میں گفتگو کرنے میں مصروف تھے۔ تحفے کے دیے اور لیے جانے کے اس منظر میں ان دونوں نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی تھی۔

اس نے اپنے کل نہ آنے پر معذرت کی اور کسی دن ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر پر آنے کا وعدہ بھی کیا۔ اس نے ایک بار بھی حیدر کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ بس بی بی سے باتیں کرتے ہوئے اس کی آواز سن رہی تھی۔ اس دوران چائے سرو کی جا چکی تھی۔

”تم کیا کر رہی ہو آج کل؟“ حیدر کا اس سے پوچھا جانے والا یہ سوال اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ بری طرح چونک گئی۔ اسے ذرا سی بھی امید نہیں تھی کہ وہ یوں براہِ راست اسے مخاطب کرے گا۔ اس کی صبح کی بدتمیزی کے بعد تو اسے اب اس سے کبھی بھی بات ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔

”میں...... کچھ بھی نہیں۔“ اتنے غیر متوقع سوال کا وہ اور کوئی ڈھنگ کا جواب نہیں دے پائی تھی۔

”لیکن تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمہارا یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کا پروگرام ہے۔“ اس نے ہونق نگاہوں ۔ اس کی طرف دیکھا۔ یہ بات اس نے حیدر مسعود سے کب کہی تھی اسے اپنا ایسا کوئی جملہ یاد نہیں آیا تھا۔

”اس نے آپ کو یہ بات نہیں بتائی توفیق بھائی؟“ وہ اب ان سے سوالیہ انداز میں مخاطب تھا۔ اس ۔ پہلے کہ وہ بیٹی کی ہونق شکل پر نگاہ ڈالتے وہ خود ہی مزید بولا۔

”مجھ سے تو اس نے اس بارے میں خوب لمبی چوڑی گفتگو کی تھی۔ میرا ماسٹرز کرنے کا ارادہ ہے۔ گریجویشن کی بھی کوئی ویلیو ہے، وغیرہ وغیرہ۔“ وہ اتنے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بول رہا تھا کہ توفیق کمال بھی جھوٹ کو پکڑ نہیں پائے تھے۔ انہوں نے بیٹی کے جھکے ہوئے سر پر ایک نظر ڈالی اور سنجیدگی سے بولے۔

”میں اس سے کمپیوٹر کا کوئی کورس کرنے کے لیے کہہ رہا تھا لیکن اگر اس کا ماسٹرز کا ارادہ ہے تو یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ وہ اس کی ذات سے منسوب کر کے ایسی باتیں کیوں کہہ رہا تھا جو اس نے کبھی کہی ہی نہیں تھیں وہ سمجھنے سے قاصر تھی لیکن اب سب کے سامنے وہ اسے جھٹلا نہ سکتی تھی۔

”اتنے مزے سے فارغ بیٹھی ہوئی ہو۔ کچھ پتا ہے یونیورسٹی میں ایڈمیشنز شروع ہو چکے ہیں۔ تین چار پہلے میں نے اخبار میں ایڈمیشنز کے متعلق پڑھا تھا۔ اب اگر اخبار پڑھا ہوتا تو پتا ہوتا کہ ایڈمیشنز شروع ہو ہیں۔ کیا آخری ڈیٹ پر فارم جمع کروانے کا ارادہ ہے؟“ وہ ہمیشہ اسی طرح سے نروس سی رہتی تھی اس لیے وقت اس کی خاموشی اور نروس نیس کسی کے لیے بھی اچنبھے کا باعث نہیں تھی۔

”اس نے مجھے بتایا نہیں ورنہ میں اسے فارم منگوا دیتا۔“ وہ بیٹی پر افسوس بھری نگاہ ڈال کر حیدر سے بو اس میں اتنا سا بھی اعتماد نہیں تھا کہ وہ انہیں یہ بات بتا سکتی کہ وہ کمپیوٹر کا یا کسی بھی اور چیز کا کوئی کورس نہیں چاہتی بلکہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہتی ہے۔

”کل ڈرائیور کو بھیج کر فارم منگوا لینا۔“ انہوں نے اپنی مایوسی اور تاسف کو چہرے پر لائے بغیر بیٹی کو مخاط کیا تھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی سر ہلانا پڑا۔

اسے اس شخص پر انتہا سے زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ اس کی ذات سے منسوب کر کے اس نے جو جھوٹ بولے وہ اس سے ان کی وجہ پوچھنا چاہتی تھی۔ آخر اسے اس کے ذاتی معاملات میں اس قدر دلچسپی کیوں تھی؟

* * *

اگلے روز صبح گیارہ بجے حیدر کا فون آیا تھا۔

”تم نے فارم منگوا لیا؟“ اس کے ہیلو کے جواب میں اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

”نہیں۔“

”تم سے یہی امید تھی مجھے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا جواب سنے بغیر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ ریسیور ہا میں لیے حیرانی سے کھڑی رہ گئی تھی۔ ایک تو اسے اس کے ایڈمیشن کی اس قدر فکر تھی کہ صبح ہی فون کر کے ا بارے میں پوچھا تھا اور اب اس کے انکار پر کوئی تنقید اور تبصرہ کیے بغیر اچانک ہی بات ختم کر دی تھی۔ دوپہر

ڈیڑھ بجے اسے دین محمد سے حیدر کی آمد کی اطلاع ملی۔

”وہ اپنی گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ آپ کو باہر بلا رہے ہیں۔“ وہ باہر آئی تو پورچ میں اس کی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ اسے آتا دیکھ کر وہ گاڑی سے اتر گیا۔

”صرف اسے فل کرنے کا احسان کر دیجیے۔ باقی سب کچھ میں خود ہی کر لوں گا۔“ اس نے فارم اس کی طرف بڑھایا۔

”آپ کو آخر میری اتنی فکر کیوں ہے؟“ اس کا غصے سے برا حال تھا۔ اس پل اس کی فطری کمزوری اور کم اعتمادی پر غصہ حاوی ہو گیا تھا۔

”بہت دنوں بعد تم نے کوئی عقل مندی والا سوال پوچھا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس سوال کا جواب بہت ساری تفصیلات اور وقت چاہتا ہے جو فی الحال میرے پاس نہیں ہے۔ پھر کبھی فرصت سے تمہارے اس سوال کا جواب دوں گا۔“ وہ جیسے اس کے غصے کو انجوائے کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا اس بارے میں فیصلہ کرنے والے آپ کون ہیں۔ کب میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہتی ہوں۔ آپ نے کل رات جھوٹ کیوں بولا تھا؟“ اس کے چہرے کی مسکراہٹ نے اس کے غصے کو مزید بڑھایا تھا۔

”مجھے آپ کے رحم اور ترس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے الماس توفیق کے کسی رشتے دار سے کسی بھی طرح کا کوئی واسطہ نہیں رکھنا۔ آپ توفیق کمال کے بزنس پارٹنر ہیں اور جو کچھ بھی ہیں تو اپنا تعلق ان ہی تک رکھیے۔ مجھ پر عنایتیں اور نوازشیں کرنے کی آپ کو قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”تم نے کل بھی مجھ سے یہی بات کہی تھی۔ میں تم پر کیوں ترس کھاؤں گا امِ ایمن۔ تم میں ایسی کیا کمی ہے جو تم پر ترس کھایا جائے۔“ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی جگہ سنجیدگی نے لے لی تھی۔

”تو پھر میرے باپ نے آپ سے کہا ہو گا کہ میری بیٹی کو کچھ سدھار دو۔ وہ تھوڑی پڑھ لکھ جائے، اسے ہمارے ماحول کے مطابق اٹھنا بیٹھنا اور لوگوں سے بات کرنا آ جائے۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اسے رونا نہیں ہے، وہ بالکل بھی نہیں روئے گی۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو سمجھایا۔

اس نے ایک دم ہی اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف جانے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے تو حیرت سے گنگ کچھ بول نہیں پائی لیکن اگلے لمحے اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے غصے سے کہا۔

”آپ میرا ہاتھ چھوڑیں۔“ وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اندر آتے ہی اس نے ایمن کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”آئی ایم سوری، لیکن وہاں گیٹ پر چوکیدار کھڑا تھا اور بھی کوئی ملازم وہاں آ سکتا تھا۔ پورچ میں کھڑے ہو کر اس طرح کی بات کرنا بالکل صحیح نہیں تھا۔“ وہ صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ ویسے ہی کھڑی ہوئی تھی۔

”ہاں اب بولو، تم کیا کہہ رہی تھیں۔“ اس کا دل چاہا وہ ٹیبل پر سے ایش ٹرے اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔

”میں کچھ بھی نہیں کہہ رہی تھی۔ آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔“ وہ مشتعل انداز میں بولی۔

”تمہیں توفیق بھائی سے جو بھی شکایتیں ہیں اور چاہے وہ سب درست بھی ہوں تب بھی تمہیں ان کا احترام کرنا چاہیے۔ ان کا نام لینا یا میرا باپ کہنا بہت بدتمیزی کی بات ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ امِ ایمن جیسی اچھی لڑکی کسی بدتمیزی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔“ اس نے بہت نرم انداز میں اسے اس کی بدتمیزی کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ ”مجھ سے انہوں نے تمہارے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ یہ ایڈمیشن کی بات اگر میں نے کی ہے تو خود کی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک ذہین اور باصلاحیت لڑکی کو ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“ اس کا سنجیدہ لہجہ ہنوز نرمی لیے ہوئے تھا۔

”آپ میری جھوٹی تعریفیں مت کریں۔ میں کوئی بچی نہیں ہوں جو ان تعریفوں پر خوش ہو جاؤں گی۔“ بولتے بولتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ”جو میں ہوں، وہ مجھے پتا ہے۔ مجھ میں کوئی خوبی نہیں۔ مجھ میں کوئی صلاحیت نہیں۔ میں توفیق کمال کی بیٹی نہیں لگتی۔ نہ شکل صورت میں نہ عادتوں میں نہ ذہانت میں اور اسی وجہ سے انہوں نے مجھے ڈس اون کر دیا ہے کیونکہ میں ان کے جیسی نہیں۔ میں اپنی ماں کے جیسی ہوں۔“

”انہوں نے تمہیں ڈس اون نہیں کیا امِ ایمن۔“ وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گیا تھا۔ ”اور تم توفیق کمال کی بیٹی لگتی ہو۔ شکل صورت اور عادتیں چاہے تمہاری ان کے جیسی نہیں ہیں لیکن ذہانت تمہارے پاس بالکل ویسی ہی ہے۔ تم نے ان سے وراثت میں ذہانت لی ہے۔ ابھی تمہیں خود نہیں پتا لیکن میں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ اگر کوئی تمہیں صحیح سمت میں چلنا سکھا دے تو تم کہاں پہنچو گی۔ تمہیں بہت آگے جانا ہے۔ بس اس کے لیے تمہیں تھوڑی سی محنت کرنی ہوگی۔ خود پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ اپنی صلاحیتوں کو درست طریقہ سے استعمال کرنا ہوگا اور میری ان سب باتوں میں سے کوئی بات بھی جھوٹ نہیں ہے۔“

”میں آپ کی کسی بھی بات کا یقین نہیں کروں گی۔ آپ کو پتا نہیں ہے کہ میں اب تک ان کے سامنے کیسی ثابت ہو چکی ہوں۔ اس گھر میں آنے کے پہلے دن سے لے کر آج تک میں مسلسل کچھ نہ کچھ ایسا کرتی رہی ہوں جو ان کی نظروں میں میرا امپریشن مزید خراب کر چکا ہے۔ اگر مجھ میں واقعی کوئی ذہانت ہوتی تو میں ان کے سامنے کسی نہ کسی بات سے تو اسے ثابت کر ہی دیتی۔“ وہ ابھی بھی رو رہی تھی۔

”تم ان کی بیٹی ہو، ان کی کوئی ملازمہ نہیں۔ باپ بیٹی کے رشتے میں امپریشن کا سوال کہاں سے آ گیا کہ اگر اچھی کارکردگی ہوئی تو باس خوش ہوں گے ورنہ نہیں۔ کام درست اور وقت پر کریں گے، اچھا رزلٹ دیں گے ملازمت برقرار رہے گی ورنہ نکال دیے جائیں گے۔ تم کچھ اچھا کرو گی تو بھی ان کی بیٹی کہلاؤ گی اور برا کرو گی بھی۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

”یہ بات آپ کہہ رہے ہیں لیکن وہ ایسا نہیں سمجھتے۔ میری ماں انہیں پسند نہیں تھی اس لیے انہوں نے انہیں چھوڑ دیا۔ جو لوگ اور جو چیزیں انہیں اچھی نہیں لگتیں، وہ انہیں خود سے ہٹا دیتے ہیں۔ جس روز وہ مجھ سے مکمل طور پر مایوس ہو گئے تو مجھے بھی خود سے دور ہٹا دیں گے۔“

”تم توفیق بھائی کو غلط سمجھ رہی ہو ام ایمن! تم ان کی بیٹی ہو۔ بیوی اور بیٹی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بیوی کو چھوڑا جا سکتا ہے بیٹی کو نہیں، وہ تمہیں کبھی نہیں چھوڑیں گے، کبھی تمہیں خود سے دور نہیں کریں گے، چاہے تم کچھ بھی کرو۔“ وہ نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”جیسے انہوں نے پچھلے انیس سالوں میں مجھے بھلائے رکھا ہے ایسے ہی اب بھی وہ مجھے بھول بھی سکتے ہیں اور چھوڑ بھی سکتے ہیں۔ ان کی زندگی میں میری کیا اہمیت ہے میں جانتی ہوں۔ ان کی زندگی میں میری یہ اہمیت تھی کہ وہ مجھ سے فون پر ایک مختصر سی گفتگو کر کے اپنے کسی جاننے والے کو مجھے لانے کے لیے کہہ کر خود امریکہ اپنے لاڈلے بیٹے کی سالگرہ منانے اور اس کی دلجوئی کرنے چلے گئے۔ انہیں اپنے بیٹے کی بہت فکر تھی، برسوں سے نظر انداز کی ہوئی بیٹی کی نہیں۔ وہ بیٹی جو دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی تھی، جس کا مسئلہ یہ نہیں تھا کہ بوسٹن میں اس کا دل نہیں لگ رہا، اسے اپنا کراچی کا عالی شان گھر اور محبت کرنے والے ماں باپ یاد آ رہے ہیں بلکہ یہ کہ اس کے پاس عالی شان نہ معمولی کوئی گھر ہی نہیں تھا۔ محبت کرنے والا یا نفرت کرنے والا نہیں بلکہ سرے سے اپنا کہنے کے لیے کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔ اب آپ یہ مت کہیے گا کہ میں بدتمیزی کر رہی ہوں یا انہیں غلط سمجھ رہی ہوں۔“ وہ روتے ہوئے غصے سے بولی۔

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تمہارا ان سے یہ شکوہ بالکل جائز ہے۔“ اس نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا، پہلی بار وہ ان کا دفاع کرنے کے بجائے اسے ٹھیک کہہ رہا تھا۔

”جب توفیق بھائی نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ میں تمہیں حیدر آباد سے کراچی لے آؤں تو مجھے یہ بات بہت عجیب لگی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت ان کے جانے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا، وہ ایئر پورٹ جانے کے لیے گھر سے نکلنے والے تھے لیکن اتنی بڑی بات سننے کے بعد انہیں اپنا جانا ملتوی کر دینا چاہیے تھا۔ سائر کے پاس الماس آپی چلی جاتیں اور توفیق بھائی تمہارے پاس خود حیدر آباد آتے لیکن میں ان سے اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ یہ ان کا اتنا زیادہ پرسنل معاملہ تھا کہ باوجود انتہائی قریبی تعلق کے میں اس پر کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ میرے کہنے کا یہ مطلب لیتے کہ مجھے ان کی بیٹی کو اپنے ساتھ لانے اور اپنے گھر میں ٹھہرانے پر اعتراض ہے۔

مگر جب حیدر آباد سے کراچی آتے ہوئے راستے میں میں نے تمہیں روتے دیکھا تو مجھے حقیقتاً بہت دکھ ہوا تھا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ تمہیں صرف اپنی امی کے مرنے کا دکھ نہیں رلا رہا بلکہ توفیق بھائی کا خود تمہیں لینے کے لیے نہ آنا بھی رلا رہا ہے۔“ اس کی آواز میں سنجیدگی کے ساتھ کچھ دکھ بھی شامل ہو گیا تھا۔

”صرف نہ آنا نہیں۔“ وہ روتے ہوئے آہستہ آواز میں بولی۔

”آپ تو اس وقت ان کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ سنا تھا ناں آپ نے، انہوں نے فون پر مجھ سے کیسے بات کی تھی۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ وہ میری ان کے ساتھ زندگی میں پہلی بات تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ بیٹی کے ساتھ بات کرنے پر انہوں نے اس سے کیا کہا تھا، کس لہجے میں کہا تھا مجھ سے پہلی مرتبہ ملنے پر انہوں نے کیا کیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے سرسری سے انداز میں میرے سلام کا جواب دے دیا تھا۔

مجھے ایسا لگتا ہی نہیں ہے کہ وہ میرے باپ ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے میں کسی اجنبی کے گھر میں رہ رہی ہو

”ہر آدمی کا اپنا مزاج ہوتا ہے ام ایمن! توفیق بھائی کی نیچر اسی قسم کی ہے۔ وہ سب سے ہی فاصلہ رکھ
ہیں۔ وہ جذباتی انداز نہیں اپنا سکتے، محبت بھری باتیں نہیں کر سکتے۔ وہ سائر کے ساتھ بھی ایسے ہی ہیں۔
بری جیسی بھی ہے لیکن یہ ان کی عادت ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتے۔ وہ اس سے بھی محبت کرتے ہیں اور تم سے
بس ان کا محبت کرنے کا انداز مختلف ہے۔ جیسا تم چاہتی ہو کہ وہ تمہیں پیار کریں، تمہارے ساتھ بیٹھ کر
کریں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے۔“ وہ اس کی شکایتوں کے جواب میں بردباری سے بولا۔

”آپ پھر ان کی طرف داری کر رہے ہیں۔ آپ ان کے بیٹے کے ساتھ مجھے مت ملائیں۔ وہ بچپ
ان کے ساتھ تھا۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی اپنے پاس ماں اور باپ دونوں کو دیکھا تھا، اسے سب کچھ میسر تھ
باپ کی محبت، آسائشیں، اچھی تعلیم، بہترین زندگی...... اور میں؟ زندگی کے تیرہ سال تک مجھے یہ ہی نہیں پتا
میرا باپ کہاں ہے؟ وہ زندہ ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر اس نے میری ماں کو چھوڑ دیا ہے تو کیوں۔ میں امی سے
باپ کے متعلق پوچھتی تو وہ مجھ سے کہتیں کہ وہ ملک سے باہر ہیں۔ شروع شروع میں میں نے ان کی اس
یقین کر لیا لیکن جیسے جیسے میں بڑی ہوئی تو میرے دل میں سوالات اٹھنے لگے۔ وہ باہر تھے تو کبھی ہم لوگو
ملنے کیوں نہیں آتے تھے، کبھی ہمیں کوئی خط کیوں نہیں لکھتے تھے، فون کیوں نہیں کرتے تھے۔ سات آٹھ س
عمر میں ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ امی مجھ سے جھوٹ بولتی رہی ہیں۔ آپ نے دیکھا تھا ناں میں کس گھر میں رہ
میں بچپن سے اسی گھر میں رہتی تھی۔ میری امی تعلیم یافتہ نہیں تھیں۔ وہ لوگوں کے کپڑے سیتی تھیں، گھر پر
قرآن شریف پڑھاتی تھیں، بہت مشکلوں سے ہمارا گزارا ہوتا تھا۔ دس گیارہ سال کی عمر آتے آتے یہ ہوا
لوگوں سے کہنے لگی کہ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ مجھے یہ جواب زیادہ بہتر لگتا تھا بجائے ”وہ ملک سے
ہیں“ والے جھوٹ کے۔ ایک مرتبہ امی نے میرا یہ جھوٹ سن لیا۔ وہ مجھ پر بہت ناراض ہوئیں۔ میں اپنے
باپ کو مار رہی تھی اس بات پر خفا ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں خود ہی شاید یہ احساس ہو گیا تھا کہ مجھے ساری با
دینی چاہیے۔ تب تیرہ سال کی عمر میں امی کی زبانی میں نے اپنے باپ کے بارے میں سب کچھ سنا تھا۔

توفیق کمال، ایک غریب گھر میں پیدا ہونے والے بڑے آدمی۔ وہ غلط جگہ پیدا ہو گئے تھے۔ جس
میں وہ پیدا ہوئے وہ ان جیسے ذہین اور شاندار انسان کے شایان شان نہیں تھا اور انہوں نے خود کو کبھی بھی
اس غربت بھرے پسماندہ ماحول کا حصہ نہیں بننے دیا تھا۔ انہیں زندگی میں بہت آگے جانا تھا، وہ اپنے ما
کے اکلوتے بیٹے تھے اور انہوں نے بیٹے کی قابلیت اور غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اسے شروع سے
تعلیمی اداروں میں تعلیم دلوائی تھی۔

میری امی ان کی کزن تھیں۔ ان کی خالہ کی یتیم بیٹی وہ بچپن سے ایک ساتھ ایک ہی گھر میں رہے تھے۔
کمال کو اپنی اس ڈری سہمی اور بزدل سی کزن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ اپنے اس ہینڈسم اور غیر معمولی خ

کے مالک کزن سے دل ہی دل میں محبت کرنے لگی تھیں۔

پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کراچی چلے گئے۔ وہ اتنے جینئس، اتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور میری امی انہوں نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے غریب خالہ اور خالو پر اپنی تعلیم کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔ ایم بی اے کے بعد جب بیٹا کراچی ہی میں بہت اچھی جاب بھی کرنے لگا تو میری دادی کے دل میں بیٹے کی شادی کا ارمان جاگا۔ بہو ڈھونڈنے کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ انہیں اپنی بھانجی سے زیادہ پیارا کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ اس رشتے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں تھے۔ انہوں نے اس شادی سے صاف صاف انکار کر دیا تھا۔ ان دنوں دادی بہت بیمار تھیں۔ انہیں اپنے بعد بھانجی کے تنہا رہ جانے کی فکر تھی۔ دادا کا چند سال پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ ماں کی بیماری دیکھتے ہوئے وہ ان سے مزید کچھ کہہ نہیں سکتے تھے اس لیے انہوں نے میری امی سے بات کی۔ انہیں بتایا کہ وہ ان سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔ ان کی آئیڈیل لڑکی ابھی انہیں نہیں ملی ہے لیکن وہ جو کوئی بھی ہو گی کم از کم زینب ہاشم ہرگز نہیں ہو گی۔ اتنے واضح انکار کے بعد بھی میری امی اپنی محبت سے دستبردار نہیں ہوئیں۔ ان کا ہونے والا شوہر شادی سے پہلے ہی انہیں قبول کرنے سے انکار کر رہا ہے انہیں اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

وہ چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ ساتھ اگر امی بھی انکار کر دیں تو دادی مان جائیں گی مگر امی نے انکار نہ کر کے انہیں اس مشکل میں ڈالا کہ وہ شادی کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ دادی کی وجہ سے مجبوراً قائم ہونے والا یہ رشتہ جب تک ہی چلا جب تک کہ دادی زندہ رہیں۔ میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی دادی کا انتقال ہو گیا تھا۔ دادی کے انتقال کے فوراً بعد انہوں نے دوسری شادی کر لی۔ جس کمپنی میں جاب کر رہے تھے وہاں کے مالکوں میں سے کسی کی بیٹی سے۔ وہ اسی دنیا میں پہنچ گئے تھے جو ان کی دنیا تھی۔ جہاں زینب توفیق اور رامین کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ اپنی دنیا میں مگن ہو گئے انہوں نے مجھے اور امی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ امی سے اپنے باپ کے بارے میں یہ ساری باتیں سن لینے کے باوجود بھی وہ میرے لیے زندہ نہیں ہو گئے تھے۔

اور زندگی کے اتنے برسوں بعد وہ اچانک میرے لیے زندہ ہو گئے ہیں تو مجھے وہ سارے تکلیف دہ سچ یاد آنے لگے ہیں۔ میرے باپ کی زندگی میں نہ کل میری کوئی اہمیت تھی اور نہ آج ہے۔ اگر ہوتی تو وہ امی کو اور مجھے یوں تو نہ چھوڑتے۔ امی سے رشتہ چاہے مجبوراً جوڑا تھا تب بھی اور کسی کی خاطر نہ سہی صرف اپنی اولاد کی خاطر ہی اسے نباہ تو سکتے تھے۔ وہ میرے پیدا ہونے پر حیدر آباد گئے تو انہوں نے بیٹی کی پیدائش پر بیوی کو اپنی دوسری شادی کی خبر تحفے کے طور پر دی۔ انہوں نے یہاں پر تو کبھی کسی کو بتایا بھی نہیں ہو گا کہ ان کی حیدر آباد میں ایک اور بیوی اور ایک بیٹی بھی ہے۔ امی کے خط کے ذریعے آپ لوگوں کو پتا چلا ہو گا کہ توفیق کمال کی کوئی بیٹی بھی ہے۔"

وہ اپنی بات کے اختتام پر طنزیہ انداز میں ہنسی۔ اس نے بہت بے دردی سے اپنے آنسو بھی صاف کر لیے تھے۔

"انہوں نے اس بارے میں کبھی کوئی بات کسی سے نہیں چھپائی۔ ہم سب شروع سے جانتے تھے کہ الماس آپی کے ساتھ ان کی دوسری شادی ہے۔ ہمیں یہ بھی پتا تھا کہ ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو کیوں چھوڑا، یہ سب کم از کم میں تو نہیں جانتا تھا اور مجھے ان کے ماضی کو جاننے میں کوئی دلچسپی بھی نہیں۔" وہ اس کے پاس سے ہٹ کر واپس صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

"ہاں تمہارے یہاں آنے کے بعد میں نے اس بارے میں ضرور سوچا تھا مگر توفیق بھائی سے ان کی ذاتی باتیں پوچھنا مجھے مناسب نہیں لگا تھا لیکن الماس آپی دس پندرہ دن پہلے خود ہی میرے ساتھ اس موضو باتیں کرنے لگیں تو میں نے ان سے بعض باتیں پوچھی تھیں۔" وہ بولتے بولتے چند لمحوں کے لیے خاموش تھا۔ "پتا نہیں مجھے یہ بات تمہیں بتانی چاہیے یا نہیں کیونکہ میرے خیال سے تو یہ بات خود تمہاری امی کو تمہیں دینی چاہیے تھی۔"

"توفیق بھائی نے الماس آپی سے شادی کے چند مہینوں بعد ہی تمہاری امی کو طلاق دے دی تھی۔ وہ رشتے کو مزید قائم رکھنا نہیں چاہتے تھے جب کہ تمہاری امی طلاق نہیں چاہتی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں دینے کے بعد خود ان کی کسی دوسری جگہ شادی کروا دیں اور اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ کراچی لے جائیں مگر تمہار نے ان ساری باتوں سے انکار کر دیا تھا۔ وہ طلاق کے لیے اس شرط پر راضی ہوئی تھیں کہ پھر وہ زندگی بھر سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے اور یہ کوئی وقتی جوش یا غصہ نہیں تھا۔

توفیق بھائی نے بعد میں تم سے ملنے کی کوشش کی تو انہوں نے انہیں اپنی شرط یاد دلا کر ملنے سے روک تمہارے خرچے کے لیے رقم بھیجی تو انہوں نے وہ واپس کر دی۔ میں توفیق بھائی کی کوئی حمایت یا طرف نہیں کر رہا۔ یہ نہیں کہہ رہا کہ وہ بالکل ٹھیک تھے اور تمہاری امی غلط۔ وہ یقیناً غلط تھے مگر تم اس الزام سے تو انہیں بری کر دو کہ انہوں نے زندگی میں کبھی تمہیں کوئی آسائش دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ محبت چاہے تم دیتے تم سے ملنے چاہے نہ آتے لیکن تمہیں پابندی سے تمہارے اخراجات کے لیے رقم ضرور بھیجتے لیکن تم امی نے انہیں ایسا نہیں کرنے دیا۔ تم سچائی اور ایمان داری سے تجزیہ کرو تو توفیق بھائی کے ساتھ ساتھ وہ بھی سی باتوں کے لیے قصور وار ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک ایسے انسان سے شادی کی جو انہیں قیمت پر قبول کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اس شادی میں تمہاری دادی کے ساتھ ساتھ تمہاری امی بھی قصور وار تھیں۔ ان کی دوسری غلطی یہ تھی کہ نے تمہیں تمہارے باپ سے دور کر دیا۔ توفیق بھائی چاہے دنیا دکھاوے کو یا رسماً ہی بیٹی کی خیر خبر رکھنا چاہتے انہیں توفیق بھائی کو ایسا کرنے سے روکنا نہیں چاہیے تھا۔

تمہارا حق تھا کہ تم اچھی زندگی گزارتیں، باپ کا پیسہ استعمال کرتیں، باپ سے ملتیں، توفیق بھائی تم سے ان سے وقتاً فوقتاً ملتے رہتے تو آج تم دونوں کے بیچ یہ دوری اور اجنبیت نہ ہوتی۔ ان کی لڑائی اپنے شو ساتھ تھی اور مان لو کہ جائز تھی تب بھی انہوں نے تمہیں تمہارے حقوق سے محروم رکھ کر اچھا نہیں کیا۔" وہ عالم میں بیٹھی تھی۔ امی نے اتنی بڑی بات اس سے چھپائی۔ انہوں نے اسے سب کچھ بتایا مگر یہ نہیں بتایا کمال اب ان کے شوہر نہیں ہیں۔

"تم اس وقت شاک میں ہو۔ میں باقی باتیں تم سے بعد میں کروں گا۔" وہ ایک دم ہی صوفے سے تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھی۔ وہ ڈرائنگ روم سے چکا تھا جب کہ وہ ویسی ہی بیٹھی تھی۔

"تو آپ اتنی شدید محبت کرتی تھیں توفیق کمال سے۔" اس نے گہری سانس لی۔

اس کے تصور میں امی کے آخری دنوں کے وہ سب مناظر گھومنے لگے جب وہ بیڈ پر لیٹ کر گھنٹوں اپنی شادی کی تصویروں کو دیکھتی رہا کرتی تھیں۔ توفیق کمال کے ساتھ ان کی یک طرفہ محبت اتنی شدید تھی کہ انہوں نے زندگی کی آخری سانس تک خود اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا تھا کہ وہ انہیں طلاق دے چکے ہیں۔

کیا محبت ایسی چیز کا نام ہے جو انسان کو عقل اور شعور کے بجائے سچائیوں سے فرار کا راستہ دکھائے؟ انہوں نے سب کچھ جانتے بوجھتے ایک ایسے شخص سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا جو ان کے لیے نہیں بنا تھا۔ انہوں نے خود اپنے لیے کھائی کا انتخاب کیا تھا۔ زندگی کو خود اپنے لیے مشکل بنایا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ شخص ان کا کبھی نہیں ہو سکتا پھر بھی انہوں نے سچائی سے منہ موڑ لیا۔

اسے آج سمجھ میں آ رہا تھا کہ اسے اپنی ماں ایک نارمل عورت کیوں نہیں لگتی تھی۔ وہ کبھی بیٹھے بیٹھے مسکرایا کرتیں اور کبھی اچانک ہی بغیر کسی بات کے رونا شروع کر دیتیں۔ وہ لوگوں سے نہیں ملتی تھیں' وہ کہیں جاتی نہیں تھیں' اس خوف سے کہ کہیں کوئی ان سے ایسا سوال نہ کر لے جو ان کی خیالی دنیا کو تباہ کر ڈالے۔ اپنی زندگی کے آخری دن۔ وہ دن جب وہ انتہائی تکلیف میں تھیں تب بھی انہوں نے اس سے اپنی شادی کی البم نکلوا کر دیکھی تھی۔ وہ تصویروں میں خود کو توفیق کمال کے برابر میں بیٹھا دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

اس روز اسے امی پر یہ سوچ کر غصہ آیا تھا کہ وہ اس بے حس اور ظالم انسان سے اب بھی محبت کرتی ہیں لیکن آج اسے ان پر غصہ نہیں آ رہا تھا۔ وہ اب اپنی مری ہوئی ماں پر غصہ کر کے کر بھی کیا سکتی تھی۔ اب انہیں کبھی واپس نہیں آنا تھا جو وہ ان سے لڑ سکتی۔ یہ پوچھ سکتی کہ انہوں نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ وہ کس کو الزام دے؟ اپنے باپ کو کہ اس نے اس کی ماں کو طلاق کیوں دی؟ یا پھر اپنی ماں کو جس نے اسے باپ کے ہوتے ہوئے یتیموں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔ وہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی اور وہ بیڈ پر لیٹ کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔

* * *

رشیدہ نے اسے حیدر کے فون کا بتایا تھا۔ وہ بات کرنے سے انکار کر کے بیڈ پر ویسے ہی لیٹی رہی جیسے دوپہر سے لیٹی تھی۔

"کہہ دو وہ سو گئی ہیں۔" وہ اس کا جواب سن کر کمرے سے نکل گئی لیکن صرف دو منٹ بعد ہی وہ کورڈ لیس ہاتھ میں لیے واپس کمرے میں آ گئی۔

"وہ مجھ پر ناراض ہو رہے ہیں' کہہ رہے ہیں کہ نو بجے کوئی سونے کا ٹائم نہیں ہوتا۔ میری بات کراؤ۔" اس نے حیدر کی کہی بات دہراتے ہوئے ڈرتے ڈرتے اسے دیکھا۔ کورڈ لیس اس کے ہاتھ سے لے کر اس نے اسے جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔

"ہیلو۔" اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا وہ اس وقت کسی سے بھی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟" وہ اس کے سو جانے والے جھوٹ کا ذکر کیے بغیر اس کی خیریت پوچھنے لگا۔

"جی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"تم نے کھانا کھایا؟"

"نہیں۔" اس نے پھر یک لفظی جواب دیا۔ "یہ تو بہت بری بات ہے۔ نو بج چکے ہیں تم نے اب تک
نہیں کھایا۔ جاؤ جا کر کھانا کھاؤ۔" وہ جواباً خاموش رہی تھی۔

"آئی ایم سوری ام ایمن۔ مجھے پتا ہے اس وقت تم نصیحتیں سننے کے موڈ میں نہیں ہو لیکن پھر بھی میں
ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں۔" ایک لمحے کے بعد اس نے اس کی سنجیدہ آواز سنی۔

"بہت سے دکھ ہماری قسمت میں لکھے ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں ملنے ہوتے ہیں۔ بعض سچائیاں ایسی ہو
کہ وہ چاہے ہمیں جتنی بھی ناگوار لگیں مگر ہمیں انہیں قبول کرنا پڑتا ہے۔ انسان ہر وقت خود پر ترس کھاتا ر
زندگی میں آنے والے دکھوں کے بارے میں سوچتا رہے تو وہ دکھ اس پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کی
میں اگر خوشیاں آتی بھی ہیں تو وہ انہیں دیکھ نہیں پاتا۔

تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے' یہ سوچنا چھوڑ دو ام ایمن! جو کچھ جیسا ہے اسے ویسا ہی قبول کر لو۔
بھول کر حال میں جینا سیکھو۔ کیا ساری زندگی تم یونہی گوشہ نشینی اختیار کرتی رہو گی؟" ہمیشہ کی طرح اس
دل پر اثر کر رہے تھے لیکن پھر بھی وہ الجھ سی گئی تھی۔

"آپ میری اتنی فکر کیوں کرتے ہیں؟" اس نے یہ سوال اس سے دوپہر میں بھی پوچھا تھا لیکن اس
اس کے انداز میں دوپہر کی طرح کا غصہ نہیں بلکہ ایک الجھن سی تھی۔ وہ جواباً ہنسا تھا۔

"ہاں! تمہارے اس سوال کا جواب تو مجھے دینا ہے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں جواب
گا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ام ایمن! جو لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں میں ان سے دوستی کر لیتا ہوں۔ ان کا خیال
ہوں' مجھے آؤٹ آف داوے جا کر بھی ان کی مدد کرنا پڑے تو کرتا ہوں۔ کسی بھی مشکل اور پریشانی میں' میں
دوستوں کو تنہا نہیں چھوڑتا۔ میرے سب دوسرے میرے ہم عمر ہیں مگر یہ کوئی ضروری نہیں کہ میں صرف ا
عمروں ہی سے دوستی کروں۔ میں ام ایمن سے بھی دوستی کر سکتا ہوں۔" وہ جواباً خاموشی سے اس کی بات
ہونے کا انتظار کرنے لگی تھی۔

"تمہیں اگر میں نے اپنی دوست نہیں سمجھا ہوتا تو تم سے کبھی اپنی ممی کے بارے میں کوئی بات نہ کی
تمہیں یاد ہے اس رات جب تم سوئمنگ پول کے پاس بیٹھی تھیں میں تمہارے پاس آیا تھا میں نے تم سے
کی باتیں کی تھیں جب کہ میں کبھی بھی کسی سے ممی کے بارے میں بات نہیں کرتا۔ سوائے بی بی' ماریہ او
انتہائی قریبی دوستوں کے' اس لیے کہ ان کے بارے میں بات کرتے وقت میں وہی اٹھارہ سال کا جذب
حیدر بن جاتا ہوں' پھر میری آنکھوں میں آنسو بھی آنے لگتے ہیں اور سوائے اپنے قریبی دوستوں کے کسی
سامنے یوں کمزور پڑنا اور جذباتی ہونا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں تمہیں پہلے روز سے دوست سمجھتا ہوں۔ سچ یہ
تم مجھے اسی طرح اچھی لگتی ہو جیسے اپنے سارے دوست اچھے لگتے ہیں۔"

"ہم دوست کبھی بھی نہیں ہو سکتے۔ آپ میں اور مجھ میں بہت فرق ہے۔" اس کی سب باتوں پر یقین کر لینے کے باوجود وہ دوستی والی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کا احساسِ کمتری ایک مرتبہ پھر اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔

"خبردار کوئی فضول بات تم میرے ساتھ ہرگز مت کرنا۔ تم صرف مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں میری دوستی قبول ہے یا نہیں؟" وہ ناراضی سے بولا۔

"ہاں' لیکن......"

"ہاں یا نہیں؟" وہ اس کی بات کاٹ کر دوٹوک انداز میں بولا۔

"ہاں۔" بے ساختہ اس کے منہ سے "ہاں" نکلا تھا۔

"میں الماس توفیق کا رشتہ دار ہوں یہ بات جاننے کے باوجود بھی؟" اس نے اس کی کہی ایک بات یاد دلائی۔ "ہاں۔" اس کا دل اس سے کہہ رہا تھا کہ اسے اس شخص پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

"ویسے وہ میری رشتہ دار ہیں نہیں۔" اس کا جواب سنتے ہی اس نے کہا۔ "تمہاری اس بات پر کہ مجھے الماس توفیق کے کسی رشتے دار سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا مجھے بہت غصہ آیا تھا۔ کسی دوسرے انسان کی اچھائی یا برائی کا ذمہ دار میں کیوں ٹھہرایا جاؤں' اگر میرا کوئی رشتہ دار یا دوست تمہیں ناپسند ہے تو تم اس کی وجہ سے مجھے بھی ناپسند کرنے لگو گی۔ یہ تو کوئی انصاف نہیں ہے۔" وہ قدرے سنجیدگی سے بولا۔

"تمہارے ساتھ ان کا جو رشتہ ہے تو اس حوالے سے تم انہیں ناپسند کرنے میں حق بجانب ہو لیکن میں انہیں ان کی بہت سی خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتا ہوں۔ ہماری آپس میں بہت اچھی انڈراسٹینڈنگ ہے۔ یہ بات تم سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میری الماس آپی کے ساتھ دوستی پر تمہیں کوئی بدگمانی نہیں ہونی چاہیے۔ ہماری فیملیز میں شروع سے بہت قریبی تعلق ہے۔ ہماری کمپنی آج جہاں ہے اس میں توفیق بھائی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے اسے اس مقام تک پہنچانے کے لیے دن رات محنت کی ہے۔ میں دس گیارہ سالوں سے ان کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ جب میں امریکہ سے پڑھ کر آیا تو میرے پاس اعلا تعلیم تھی' خود پر بھروسہ اور یقین تھا لیکن کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں نے بزنس کے سب اسرار و رموز توفیق بھائی سے سیکھے ہیں۔ وہ ایک غیر معمولی ذہین انسان ہیں۔" اس نے بہت تفصیل کے ساتھ اسے توفیق کمال اور الماس توفیق کے بارے میں اپنی پسندیدگی کی وجوہات سے آگاہ کیا۔

"آج کے لیے اتنی باتیں کافی ہیں۔ اب تم جا کر کھانا کھاؤ اور کھانے کے بعد سکون سے بیٹھ کر فارم فل کرو۔ میں فارم ڈرائنگ روم میں صوفے پر رکھا ہی چھوڑ آیا تھا۔ کچھ پوچھنا ہو تو فون کر کے پوچھ لینا میں ساڑھے گیارہ بارہ بجے تک تو جاگتا ہوں۔"

اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ وہ اٹھ کر باتھ روم میں آئی اور ٹھنڈے پانی سے منہ دھونے لگی۔ کئی گھنٹوں تک روتے رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں بالکل سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ اس کے سر میں ابھی بھی

درد ہو رہا تھا لیکن اب وہ کچھ بھی سوچے بغیر صرف کھانا کھانا چاہتی تھی۔ کسی ملازم سے کہنے کے بجائے وہ
میں آ گئی۔ اس نے اپنے لیے ایک کپ چائے اور ایک سینڈوچ بنایا اور کھانے لگی۔ اسے احساس ہوا کہ و
نہیں بلکہ اپنی خوشی سے کھا رہی ہے۔ کتنے دنوں بعد آج اس نے بھوک لگنے کے احساس کو محسوس کیا تھا۔ ا
طرح ہو گیا تھا؟ زندگی میں جو دکھ تھے وہ کہیں غائب تو نہیں ہو گئے تھے۔ وہ چائے کا کپ خالی کر کے اٹھ
کے قدم خود بخود ڈرائنگ روم کی طرف اٹھنے لگے۔ چند منٹوں بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھی فارم بھر رہی تھی

اس کے کانوں میں ایک یقین سے بھری آواز گونج رہی تھی۔ "تمہیں بہت آگے جانا ہے۔ تم واقعی
کے جیسی غیر معمولی ذہین ہو۔" اس کے ہاتھ تیزی سے فارم بھرنے لگے تھے۔ اس سارے کام سے فار
کے بعد اس نے حیدر کا موبائل نمبر ملایا۔ دوسری طرف فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

"میں نے فارم فل کر لیا ہے۔" اسے ہیلو کہنے کا موقع دیے بغیر اس نے جلدی سے کہا۔

"بہت جلدی کر لیا تم نے' شاباش۔" اس نے جواباً یوں تعریف کی جیسے فارم بھر لینا بھی کوئی مشکل کا

"میں نے Order of preference میں اکنامکس کو سب سے پہلے لکھا ہے۔" اس کے پو
اس نے خود بتایا۔

"یہ تم نے بہت ہی اچھا کیا۔ اصل میں' میں بھی یہی چاہ رہا تھا۔ میں نے کچھ کہا اس لیے نہیں تھا
مرضی سے مضمون کا انتخاب کرو۔"

"بس اب کل ہی فارم سمٹ کروا دو۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے یہ کہہ کر فوراً ہی اسے خدا حافظ کہہ دیا تھا۔

* * *

"تم نے فارم منگوا لیا؟" توفیق کمال کو دو روز بعد ناشتے کی میز پر اس سے یہ بات پوچھنے کا خیال آ

"جی۔" اس نے ان کے سوال کا مختصر جواب دیا۔ یہ نہیں بتایا کہ میں ڈرائیور کے ساتھ جا کر فارم جم
آئی ہوں۔

توفیق کمال اور الماس دونوں آفس جا چکے تھے جب کہ وہ میز پر ہی بیٹھی حیدر کے ساتھ ہونے والی
کرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ آج ہی بی بی سے ملنے چلی جائے اور حیدر کی منتخب کردہ کتابیں لے آ
اس سوچ کو عملی شکل دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

وہ ڈرائیور کے ساتھ ان کے گھر پہنچی تو انہوں نے بڑی محبت سے اس کا استقبال کیا۔ وہ آج کتنے
اس گھر میں آئی تھی لیکن یہاں آنے پر کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ لاؤنج میں ان کے س
باتیں کرتی رہی۔ زیادہ وہی بول رہی تھیں' ایمن انہیں سن رہی تھی۔ انہیں سننا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ انہ
پر اس کے لیے خاص اہتمام کروایا ہوا تھا۔ لنچ کے بعد ان کا کوئی فون آ گیا اور وہ فون پر بات کر
لاؤنج سے اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف آ گئی۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اسٹڈی میں آ گئی۔ سامنے کی میز پر ا
کتابیں رکھی نظر آئیں۔ Micro Economic اور Macro Economic پر مستند ترین ک

وہ بالکل نئے ایڈیشنز تھے۔ کتابیں اٹھا کر وہ واپس لاؤنج میں آ گئی۔ جب تک بی بی فون پر بات کرتی رہیں وہ ایک ایک کر کے ساری کتابیں دیکھتی رہی۔ فون پر گفتگو ختم کر لینے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

* * *

اس کا ارادہ تھا کہ حیدر جیکب آباد سے واپس آ جائے تو وہ اسے کتابوں کے لیے شکریہ کا فون کرے گی لیکن جب بی بی سے مل کر آنے کے پانچویں روز اس نے ان کے گھر پر فون کیا تو بی بی سے پتا چلا کہ وہ فرینکفرٹ گیا ہوا ہے۔

”لیکن وہ تو جیکب آباد گئے ہوئے تھے؟“ وہ تھوڑی سی حیران ہوئی تھی۔

”ہاں، وہاں سے تو وہ اسی دن واپس آ گیا تھا جب تم مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ اب تو اسے فرینکفرٹ گئے ہوئے بھی دو دن ہو گئے ہیں۔“ کچھ دیر بی بی کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا تھا۔ اسے اب توفیق کمال اور حیدر مسعود کے ہر وقت حالت سفر میں رہنے پر کوئی تعجب نہیں ہوتا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ وہ دونوں اپنے پاسپورٹ بھی ہر وقت اپنے بریف کیس ہی میں رکھتے ہوں گے۔ رات کو وہ حیدر کے یہاں سے لائی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی جب اس کا فون آیا۔ ”گیس کرو میں تمہیں کہاں سے فون کر رہا ہوں؟“

”فرینکفرٹ سے۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔ وہ اس کے جواب پر بے ساختہ ہنس پڑا۔

”آپ حیران ہوئے؟“

”نہیں حیران تو نہیں ہوا۔ تمہیں شاید توفیق بھائی سے پتا چلا ہو گا یا پھر بی بی سے، لیکن تمہاری اپنے بارے میں معلومات مجھے اچھی لگیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”مجھے یہاں آنا تو ہفتہ دس دن بعد تھا لیکن اچانک کچھ ایسے ضروری کام نکل آئے کہ مجھے فوراً ہی آنا پڑ گیا۔ جلدی میں آیا اسی لیے تمہیں فون بھی نہیں کر سکا۔“ وہ مزید گویا ہوا۔

”آپ اتنا زیادہ سفر کرتے ہیں، اسے انجوائے کرتے ہیں؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہاں بہت زیادہ، میں اپنے کام کو انجوائے کرتا ہوں۔ آپ جس بھی پروفیشن میں ہوں جب تک اپنے کام کو انجوائے نہیں کریں گے اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ اپنے لیے اس فیلڈ کا انتخاب کرنا چاہیے جس میں دلچسپی ہو۔“ وہ اس کے جواب پر کچھ الجھی تھی۔

”یہ کیسے پتا چلتا ہے کہ ہمیں کس کام میں دلچسپی ہے؟“

”ارے بابا! تمہیں فی الحال اس بارے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے اکنامکس میں ماسٹرز کرنے کا سوچا ہے اور بالکل ٹھیک سوچا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تمہارا ایڈمیشن بھی ہو جائے گا۔“

”میں نے تو اکنامکس یونہی لکھ دیا تھا بغیر سوچے سمجھے، آپ زبردستی مجھے ذہین ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ بی اے میں بالکل اتفاقاً میری اتنی اچھی پرسنٹیج آ گئی تھی۔“

وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ اس کی اپنے بارے میں رائے بدلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تو پھر اتفاقاً تمہارا ایڈمیشن بھی ہو جائے گا اور اتفاقاً ہی تم اکنامکس میں ایم اے بھی کر لو گی۔“

”اچھا یہ بتاؤ تم نے بکس دیکھیں؟“ اس نے خود ہی موضوع تبدیل کر دیا تھا۔

”جی ابھی میں وہی پڑھ رہی تھی۔“

”جاؤ پھر تم اسٹڈی کرو۔ میں پانچ چھ روز میں واپس آ جاؤں گا۔“ اس نے گفتگو سمیٹتے ہوئے اسے خدا حافظ کہہ دیا تھا۔

* * *

جس روز داخلہ لسٹ لگنی تھی اس روز وہ بہت پریشان تھی۔ اسے لسٹ دیکھنے کے لیے جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ ”تم لسٹ دیکھ آئیں۔“ شام چار بجے حیدر کا فون آیا تھا۔

”نہیں۔“ وہ اس جواب پر کتنا چڑا ہو گا وہ اندازہ کر سکتی تھی۔

”تمہارے بارے میں میرا کوئی اندازہ غلط نہیں ہوتا۔ مجھے اسی جواب کی امید تھی جو اطلاع تم مجھے دیتیں وہ مجھے تمہیں دینی پڑ رہی ہے۔ ہو گیا ہے تمہارا ایڈمیشن، تمہاری ساری منفی سوچوں کے باوجود۔ اب اس وقت مجھے تم پر غصہ اتنا آ رہا ہے اس لیے میں تمہیں مبارک باد بھی نہیں دے رہا۔“ وہ اس کے غصے پر دھیان دیے بغیر اس اطلاع پر خوشی سے اچھل پڑی تھی۔

”واقعی؟“ اسے ذرا سا بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

”آپ خود گئے تھے یا آپ نے کسی کو بھیجا تھا۔“ وہ شاید یہ تصدیق چاہتی تھی کہ لسٹ میں اس کا نام اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

”نہ گیا تھا نہ کسی کو بھیجا تھا۔ میں نے فون پر پتا کروایا ہے۔“ وہ اس کی خوشی کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ وہ بھول گئی تھی کہ اتنا معمولی سا کام وہ ایک فون کال کے ذریعے ہی کر سکتا ہے اس کے لیے خود جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

”خوش ہو؟“

”جی۔“ اس کے پوچھنے پر وہ فوراً بولی۔

”میں نے توفیق بھائی کو بتایا تو وہ بھی بہت خوش ہوئے بلکہ وہ خوش ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی ہوئے ہیں۔ تم نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ تم نے کس ڈپارٹمنٹ میں داخلے کے لیے اپلائی کیا ہے؟“

”وہ اس بات پر حیران نہیں ہوئے کہ آپ کو میرے ایڈمیشن کا کیسے پتا چل گیا؟“ وہ اس کے سوال کا جواب دیے بغیر جلدی سے بولی۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”وہ حیران کیوں ہوں گے؟ انہیں ہماری دوستی کا پتا ہے بلکہ بہت پہلے سے پتا ہے۔ جب تم ہمارے گھر پر رہ رہی تھیں تب ہی امریکہ سے توفیق بھائی کا فون آنے پر میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ آپ اپنی بیٹی کی بالکل فکر مت کریں۔ اس کے ساتھ میری بہت اچھی دوستی ہو چکی ہے اور اپنے دوستوں کا میں خود بہت اچھی طرح خیال رکھتا ہوں۔“ وہ اس کی حیرت پر ہنستے ہوئے بولا۔

”لیکن تب تو ہماری دوستی نہیں ہوئی تھی۔“

"تمہاری طرف سے نہیں ہوئی تھی۔ میری طرف سے ہو چکی تھی۔ تمہارا کیا خیال ہے میں یونہی اخلاقاً تمہیں چائے اور کافی بنا کر پلایا کرتا تھا۔ اپنے دوستوں کے علاوہ اس طرح کی مہربانیاں میں کسی کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔" وہ صاف گوئی سے بولا تھا۔

* * *

حیدر نے اس سے کہا تھا کہ اس کے باپ کو اس کے ایڈمیشن کا سن کر خوشی ہوئی ہے لیکن اسے تو وہ خوش نہیں لگے تھے۔ ان کے چہرے پر دور دور تک خوشی سے ملتا جلتا کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس کی ہمیشہ کی طرح ان سے کھانے کی میز پر ملاقات ہوئی تھی انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بس یہ پوچھا۔

"کلاسز کب سے شروع ہو رہی ہیں تمہاری؟" اس نے پلیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں تاریخ بتا دی۔

کھانے کے بعد انہوں نے اسے اپنے کمرے میں بلا کر ایک کافی بڑی رقم اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

"کپڑے بنا لینا اور بھی یونیورسٹی جانے کے لیے کوئی چیز خریدنی ہو تو خرید لینا۔"

ان کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود بھی اس نے حیدر کی اس بات پر یقین کر لیا تھا کہ وہ اس کے ایڈمیشن پر خوش ہیں۔

"تمہیں یونیورسٹی میں اپنی ہی طرح کی بہت ساری ڈری' سہمی اور گھبرائی ہوئی لڑکیاں نظر آئیں گی۔ تم ان میں سے کسی بھی ایک گھبرائی ہوئی لڑکی کا انتخاب کر لینا۔ اکیلے گھبرانے اور بوکھلانے کے مقابلے میں کسی دوسرے کے ساتھ مل کر گھبرانا اور بوکھلانا زیادہ بہتر رہے گا۔"

اپنے سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے اسے حیدر کی کہی بات یاد آئی۔ رات فون پر اس نے اسے پہلے دن یونیورسٹی جانے کے حوالے سے کافی سارے مشورے دیے تھے۔ اس کی شگفتہ سے انداز میں کی جانے والی یہ بات یاد کر کے اس وقت اس کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ اس نے رات اسی طرح کی بہت ساری اوٹ پٹانگ باتیں کر کے اس کی ٹینشن کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ بعض لڑکیاں اسے اپنی ہی طرح نروس نظر آ رہی تھیں اور بعض بہت مطمئن اور پر اعتماد۔

جس لڑکی کو وہ اپنے سے کچھ دور کھڑا دیکھ رہی تھی وہ اسے اپنی طرح نروس تو نہیں لگی تھی لیکن وہ اسے کچھ سادہ اور خوش مزاج ضرور لگی تھی اسی لیے وہ چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے اس کے پاس آ گئی۔

"ہیلو۔" ایمن نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں ام ایمن ہوں۔" اس نے جواباً ہیلو کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ اس طرح کبھی کسی سے بات چیت کرنے یا دوستی کرنے میں پہل نہیں کر سکتی تھی۔ یہ صرف اور صرف حیدر کے سمجھانے کا اثر تھا۔

"اور میں' رامین اخلاق ہوں۔ سینٹ جوزف سے گریجویشن کیا ہے۔ کالج تک ہم پانچ دوستوں کا گروپ تھا۔ دو نے بی اے کرتے ہی بیاہ کروا لیا اور باقی دو دوستوں نے دوسرے ڈپارٹمنٹس میں ایڈمیشن لے لیا۔ یوں اپنے گروپ کے ٹوٹنے کی وجہ سے اس وقت اکیلی کھڑی ہوں۔ سوری' کھڑی تھی۔" وہ اس کے تعارف کے دلچسپ انداز پر ہنس پڑی تھی۔

"میرے بابا نے زبردستی مجھے یہاں دھکیلا ہے۔ ورنہ میرا ارادہ انگلش میں ایم اے کرنے کا تھا۔ بابا نے کہا تمہیں لٹریچر و ٹریچر میں کوئی دلچسپی نہیں ہے' تمہاری سہیلیاں وہاں ایڈمیشن لے رہی ہیں اس لیے تم وہاں جانا چاہتی ہو۔" خوش مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ وہ باتونی بھی تھی اور ایمن کو اس کا یہ انداز اچھا لگ رہا تھا۔

"میری ایک دوست بھی بن گئی ہے رامین۔ رامین اخلاق نام ہے اس کا۔ اتنی اچھی ہے وہ اتنی مزے کی باتیں کرتی ہے' ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ آج ہم پہلی مرتبہ ملے ہیں۔" رات کو وہ حیدر کو فون پر اپنے یونیورسٹی کے پہلے دن کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ بہت دلچسپی سے اس کی ساری باتیں سن رہا تھا۔

"تمہیں مزا آیا؟ تم نے اپنا یونیورسٹی کا پہلا دن انجوائے کیا؟"

"ہاں' بہت زیادہ۔" وہ اس کے استفسار پر سچائی سے بولی۔

"مجھے پڑھائی میں کوئی مشکل ہو تو آپ سے پوچھ سکتی ہوں؟"

"بالکل پوچھ سکتی ہو۔ جس وقت دل چاہے پوچھ سکتی ہو۔" اس کے سوال کا اس نے وہی جواب دیا تھا جس کی اسے توقع تھی۔

* * *

اسے یونیورسٹی جاتے ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہونے والا تھا جب اس روز ناشتے کی میز پر توفیق کمال اپنے معمول کے جملوں میں ایک جملے کا اضافہ کر کے اس کی پڑھائی کی بابت دریافت کیا۔

"تمہاری اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں' کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟"

"جی' ٹھیک جا رہی ہیں۔" اس نے آہستگی سے جواب دے دیا تھا۔ اس ایک مہینے کے دوران اس کی را سے کافی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اپنی پڑھائی کو پوری سنجیدگی کے ساتھ لے رہی تھی۔ رامین بھی پڑھائی ک معاملے میں کافی سنجیدہ تھی۔ وہ دونوں کوئی پیریڈ بنک نہیں کرتی تھیں۔

وہ لیکچر کا کوئی پوائنٹ مس نہیں کرتی تھی۔ گھر آنے کے بعد بھی اس کے پاس دوسری کوئی مصروفیت نہیں ہو تھی سوائے اس کے کہ وہ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرے اور پھر پڑھنے بیٹھ جائے۔ وہ پہلے کی طرح اب بھی ش کے بعد کا سارا وقت اپنے کمرے میں گزارتی تھی لیکن اب پہلے کی طرح اس کے پاس بے کار بیٹھنے یا کوئی نہ دل دکھانے والی بات یاد کرنے کی فرصت نہیں ہوتی تھی۔

ناشتے کی میز پر وہ اور الماس بیٹھی تھیں۔ توفیق کمال ابھی آفس کے لیے نکلے تھے۔ وہ خود بھی جلدی جل اپنی چائے ختم کر رہی تھی کہ اسی وقت دین محمد نے اسے حیدر کے فون کے بارے میں بتایا۔ تین دن سے وہ کرا میں نہیں تھا اور اس دوران ان کی آپس میں بات نہیں ہوئی تھی۔

"آج تمہارا لاسٹ پیریڈ کب ختم ہو گا؟ میرا مطلب ہے کہ تم یونیورسٹی سے کس وقت فارغ ہو گی؟" ا کے سوال پر حیران ہوتے ہوئے اس نے وقت بتا دیا۔

"ٹھیک ہے پھر ڈیڑھ بجے میں تمہیں یونیورسٹی سے پک کروں گا۔ ڈرائیور کو منع کر دینا

"کیوں؟" اس نے اپنی حیرت کا واضح اظہار کیا۔

"مجھے تم سے کچھ ضروری کام ہے۔ وہ میں تمہیں دوپہر میں ہی بتاؤں گا۔" اس کا انداز بڑا پراسرار سا تھا۔

ابھی اس سے مزید کچھ پوچھ بھی نہیں پائی تھی کہ اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ کافی دیر تک کھڑی سوچتی رہی کہ کیا بات ہو سکتی ہے مگر اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

یونیورسٹی میں بھی سارا وقت وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ حیدر کو اس سے کیا کام ہو سکتا ہے پھر اسے اپنی اس کام والی سوچ پر ہنسی آنے لگی۔ وہ کب سے اس قابل ہو گئی تھی کہ حیدر مسعود کو اس سے ضروری کام پڑنے لگے۔ الٹا وہ خود ہر کام کے لیے اسی کی طرف دیکھتی تھی۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق ڈیڑھ بجے آ گیا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر ابھی اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں پائی تھی کہ وہ ایک نظر اس پر ڈال کر مایوسی سے بولا۔

"تم آج یونیورسٹی کچھ ڈھنگ کے کپڑوں میں نہیں آ سکتی تھیں؟" اس نے چونک کر اپنے لباس کی طرف دیکھا۔ وہ خود لباس کے معاملے میں بہت محتاط رہا کرتی تھی۔

"آپ نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ آپ مجھے بتا دیتے کہ کہاں جانا ہے تو میں اس لحاظ سے ڈریس اپ ہو جاتی۔" وہ الجھے ہوئے انداز میں بولی۔

"یہی تو بتانا نہیں تھا۔" وہ بہت تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا۔

"یہاں پر کیا کوئی فنکشن ہے؟" ایک ہوٹل کے سامنے اترنے کے لیے کہا تو وہ گاڑی سے اترنے کے بجائے سوالیہ انداز میں بولی۔

"ہاں برتھ ڈے پارٹی ہے۔" وہ مطمئن سے انداز میں کہتا ہوا گاڑی سے اترا۔

"کس کی؟" وہ ناراضی سے بولی۔ اسے اس سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ بن بلائے اسے کسی پارٹی میں لے جائے۔ "نام ایمن جانتی ہو گی تم اسے۔ میری بہت اچھی دوست ہے۔ آج اس کی سالگرہ ہے۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے اسے جواب دیا اور پھر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا گفٹ نکالنے لگا۔

وہ حیرت سے گنگ کھڑی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے اپنی سالگرہ کا دن یاد نہیں تھا لیکن اس نے اس دن کو زندگی میں کبھی کسی خاص انداز میں سیلیبریٹ نہیں کیا تھا۔

بہت دن پہلے شاید اس سے فون پر بات کرتے ہوئے یونہی کوئی ذکر نکلنے پر اس نے اسے اپنی ڈیٹ آف برتھ بتائی تھی لیکن وہ اس سے یہ توقع نہیں رکھتی تھی کہ وہ آج کے دن کو یاد رکھے گا۔ وہ دونوں ہوٹل کے اندر آ گئے تھے۔ اس کی حیرت خوشی میں بدل چکی تھی اور یہ خوشی جس نے دی تھی اس کا شکریہ تو ادا کرنا ہی تھا۔

"شکریہ! آپ نے میری سالگرہ کا دن یاد رکھا اور۔"

"اور یہ کہ اگر تم نے بھی میری سالگرہ کا دن یاد رکھا تو میں تمہارا شکریہ کبھی ادا نہیں کروں گا۔ مجھے دوستی میں شکریہ اور سوری سے زیادہ برے الفاظ کوئی نہیں لگتے۔ چلو جلدی سے کاٹو۔" اس نے چھری اور کیک کی طرف اشارہ کیا جو ویٹر لے کر آیا تھا۔

"کیسا لگ رہا ہے ٹین ایج سے نکلنا۔ خوشی ہو رہی ہو گی کہ اب ہم بڑے ہو گئے ہیں۔" ایمن نے کیک کا ایک پیس کاٹ کر پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اس کی شوخ آواز سنی۔

"ابھی تو اچھا لگ رہا ہے۔ ایک دو سال اور اچھا لگے گا۔ اس کے بعد پھر میری عمر بڑھنا رک جائے گی۔ اس نے پلیٹ اس کے آگے رکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔ وہ اس کے جواب کو انجوائے کرتے ہوئے قہقہہ ہنس پڑا تھا۔ وہ دونوں کیک کھا چکے تو تھوڑی ہی دیر میں ویٹر نے کھانا سرو کر دیا تھا۔

"میں نے تمہاری پڑھائی کا حال احوال تو پوچھا ہی نہیں۔" اپنی پلیٹ میں سلاد ڈالتے ہوئے اس پوچھا۔

"پڑھائی بس ٹھیک ہی ہے۔ ایسا ابھی تک کچھ نہیں ہوا جیسی آپ میری تعریفیں کرتے ہیں۔ میرے کس ٹیچر کو ڈھنگ سے میرا نام بھی یاد نہیں ہے' آپ کے علاوہ صرف رامین میری تعریف کرتی ہے بلکہ میری میرے لیکچرز کو فوٹو کاپی کروا کر اپنے پاس اسٹڈی کرنے کے لیے رکھ لیتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈپارٹمنٹ میں کلاس میں بھی کوئی مجھے نہیں جانتا۔ میں یہ سوچتی ہوں کہ جب میں پڑھائی میں ایسا کوئی غیر معمولی کارنا انجام نہیں دوں گی جیسی آپ کو امید ہے تو آپ کو کتنا افسوس ہو گا۔" فروٹ یوگرٹ کو انجوائے کرتے ہوئے نے تفصیلی جواب دیا۔

"تم میرے افسوس کے لیے زیادہ افسوس مت کرو۔ اگر میری پیشن گوئی غلط ہو گئی تو میں تمہارے س بیٹھ کر اپنی غلطی کا اعتراف کروں گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے اسے یقین دلایا۔

"ایک بات تو بتائیے۔ جس طرح آپ کو میری ذاتی زندگی کی ہر بات پتا ہے اس طرح مجھے آپ کی بات نہیں معلوم۔" وہ بغیر ہچکچائے بولی۔

"تم میرے گھر میں رہ چکی ہو پھر بھی یہ بات کہہ رہی ہو۔ تم میری روٹین سے واقف ہو' میرے گھر کے سے واقف ہو۔ اس کے علاوہ میری ذاتی زندگی میں ایسا کچھ نہیں جو تم نہ جانتی ہو۔ تمہیں میری شادی کے با میں بھی ضرور پتا ہو گا۔ بی بی نے ضرور تم سے اس بارے میں کوئی نہ کوئی ذکر کیا ہو گا۔" وہ اس کی طرف ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"انہوں نے ایک بار ذکر کیا تھا اور میں اس بات پر حیران ہوتی ہوں کہ آپ نے کبھی اپنی مسز کا ذ کیا۔" "ہماری طلاق ۔۔۔ ہو چکی ہے۔" اس کا جملہ مکمل ہوتے ہی اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

وہ ایسے کسی جواب کی امید نہیں کر رہی تھی۔ اتنے دنوں میں اس بارے میں اس نے یہ اندازہ لگایا تھا ک کسی وجہ سے اس میں اور اس کی بیوی میں لڑائی ہے۔ اسے جواب میں افسوس کا اظہار کرنا چاہیے تھا یا نہیں' و جانتی تھی اس لیے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

"تم رک کیوں گئیں۔ کھانا کھاؤ۔" وہ جیسے اس بارے میں مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے عجیب سا لگا۔ جب وہ اسے اپنا دوست کہتا ہے تو پھر اسے اس کو ساری بات بتانی چاہیے تھی۔ اس نے تو ایک سا جملہ بول کر بات ہی ختم کر دی تھی۔ وہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی لیکن اب اس کا موڈ خراب ہو چکا

"تم چپ کیوں ہو گئیں۔ کیا کچھ اور بھی پوچھنا چاہتی ہو؟"

"آپ نے میری پہلی بات کا صحیح سے جواب دے دیا ہے جو میں کوئی دوسری بات پوچھوں۔" وہ ذرا خفگی سے بولی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"میری شادی میری کزن جمیلہ کے ساتھ ہوئی تھی شادی سے پہلے ہماری آپس میں بہت اچھی دوستی تھی۔ پانچ سال پہلے ہماری شادی ہوئی تھی بدقسمتی سے یہ شادی ایک سال سے زیادہ چل نہیں سکی۔ اب اس شادی کے ختم ہونے میں ہم دونوں میں سے کس کا قصور تھا' اس بارے میں میں واقعی کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ جب دو افراد الگ ہوتے ہیں تو ہمیشہ اس علیحدگی کا ذمہ دار دوسرے فرد کو ٹھہراتے ہیں۔ میں تمہیں ساری بات جس طرح بتاؤں گا تو اس میں لازمی خود کو درست اور اسے غلط ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔ جبکہ شاید حقیقت یہ نہ ہو۔ اپنے طور پر میں خود کو حق پر سمجھتا ہوں لیکن ہو سکتا ہے کہ غلطی میری ہی ہو۔ میرے لیے سچائی یہ ہے کہ جمیلہ بابر چار سال پہلے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے نکل چکی ہے۔

"اب اپنے اس پھولے ہوئے منہ کو ٹھیک کرو اور جلدی سے کھانا ختم کرو۔ مجھے واپس آفس بھی جانا ہے۔" اس کے کہنے پر دوبارہ پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

اس نے دوستی کا ذکر کیا تھا لیکن محبت کا نہیں۔ کیا اسے جمیلہ بابر سے محبت بھی تھی؟ وہ اس سے یہ سوال پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ واپسی میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے تین چار کیسٹس اس کے ہاتھ میں پکڑائے۔

"ان میں سے جو تمہیں پسند ہے وہ لگا لو۔" وہ ایک کیسٹ منتخب کر کے لگانے لگی تو وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ام ایمن۔" اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

"تمہارا نام بہت خوب صورت ہے مگر تھوڑا سا لمبا ہے۔ اگر میں اسے کچھ مختصر کر دوں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا؟" اس نے ایمن کی طرف دیکھا۔

"مجھے تو سب ہی ایمن کہتے ہیں۔ آپ کے کہنے پر مجھے کیوں اعتراض ہوگا۔" وہ جواباً حیرت سے بولی۔

"ایمن نہیں ایما' مجھے یہ کہنا اچھا لگے گا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"تمہیں کیسا لگا؟"

"اچھا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ اس نے گاڑی اس کے گھر کے سامنے لا کر روک دی۔

"میں آپ کا شکریہ نہیں ادا کر رہی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آج کا دن میری زندگی کا سب سے خوبصورت دن ہے۔ میں اس دن کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" گاڑی سے اترنے سے پہلے وہ اس سے بولی۔ وہ جواباً صرف مسکرا دیا۔

* * *

اس کے پہلے سمسٹر کے ایگزامز شروع ہو گئے تھے۔ اس کی پڑھائی کا دورانیہ پہلے سے بڑھ گیا۔ پڑھتے ہوئے کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو وہ بے جھجک حیدر کو فون کر لیا کرتی تھی۔ وہ پہلا پیپر دے کر گھر آئی تو ابھی اس نے صرف اپنا بیگ اور فائل رائٹنگ ٹیبل پر رکھے تھے کہ حیدر کا فون آ گیا۔ وہ اس کے پیپر کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ صرف یہ نہیں کہ پیپر اچھا ہوا یا برا۔ اس نے پوری تفصیل سے پیپر میں آنے والے سوالات کے بارے میں پوچھا۔ پھر صرف اس پہلے پیپر میں ہی نہیں اس نے تمام پیپرز میں اسی طرح فون کر کے پیپر کے بار
پوچھا۔

اسے کچھ چیزیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر تک دماغ سوزی کرنے کے بعد اس نے حید
کرنے کا سوچا۔

"بولو ایما۔" اس نے فوراً ہی کال ریسیو کی تھی۔ "توفیق کمال کے گھر کا نمبر دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھ
وقت فون کرنے والی شخصیت کون ہے۔"

"آپ اس وقت کہاں ہیں؟" اسے کچھ شور سنائی دے رہا تھا۔

"میں اس وقت ایک ڈنر میں آیا ہوا ہوں۔ اچھا تم ایک منٹ ہولڈ کرو۔" اسے جواب دیتے ہوئے
اپنے پاس موجود کسی شخص سے "ایکسکیوز می میں تھوڑی دیر میں آپ کو جوائن کرتا ہوں۔" کہا وہ شاید اس
کرنے کے لیے کسی الگ جگہ پر آ گیا تھا۔

"ہاں اب بولو۔" اس نے چند سیکنڈز بعد اس کی آواز سنی۔

"مجھے آپ سے ایک دو چیزیں سمجھنی تھیں۔ لیکن ابھی تو آپ مصروف ہیں۔ میں بعد میں پوچھ لو
اپنا جملہ تیزی سے مکمل کرتے ہوئے اسے خدا حافظ کہنے کا ارادہ رکھتی تھی کہ وہ جلدی سے بولا

"یہاں پر کھانا شروع ہو چکا ہے۔ مجھے تھوڑی دیر اور لگے گی پھر میں تمہارے پاس گھر پر ہی آ جاتا

"آپ پلیز میری وجہ سے۔" وہ بے ساختہ بولی لیکن اس نے ناراضی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"ابھی ساڑھے دس بجے ہیں' میں گیارہ بجے تک آتا ہوں۔" وہ بات ختم کر چکا تھا جبکہ وہ اپنی وجہ
ڈسٹرب کرنے پر شرمندہ ہو رہی تھی۔ اپنی بک' لیکچر نوٹ بک اور فائل لے کر وہ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئ
گیارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے' تب وہ آ گیا۔

"آپ میری وجہ سے ڈنر چھوڑ کر آئے ہیں نا؟" وہ کچھ شرمندگی سے بولی۔

"دیکھو دیر بہت ہو گئی ہے۔ ادھر ادھر کی فالتو باتوں کے بجائے جلدی سے کام کی بات پوچھو۔"
بیٹھتے ہوئے اس نے حکمیہ انداز میں اسے ٹوکا۔ اس نے فوٹو اسٹیٹ ہوئے تین چار ٹائپ شدہ کاغذا
طرف بڑھائے۔

"ہمیں ہمارے ٹیچر مس نائلہ یہ سبجیکٹ پڑھا رہی ہیں۔ انہوں نے آخری کلاس میں یہ پیپرز س
میں تقسیم کروائے تھے یہ کہہ کر کہ جو ان پرابلمز کو حل کرنا چاہے کر لے اور جو نہ کرنا چاہے تو رہنے دے
وہ سوالات پر نظریں ڈالتا رہا اور وہ اسے یہ ساری بات بتاتی رہی۔

"تم نے کچھ خود سے حل کرنے کی کوشش کی؟"
اس نے ان صفحوں پر سے نظریں ہٹا کر اس سے پوچھا۔

"ہاں میں نے یہ سارے کے سارے سوال کرنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ میں' میں اٹک گئی ہوں

چھ میں نے حل کر بھی لیے ہیں تو یہ کیسے کنفرم کروں کہ میں نے ٹھیک کیا ہے۔'' ٹیبل پر سے فائل اٹھا کر اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے اس نے بتایا اس نے فائل کھول لی تھی۔

''تم نے سارے سوال ٹھیک کیے ہیں۔'' وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

''آپ نے اتنی جلدی دیکھ بھی لیا۔ صحیح طرح سے دیکھیں۔ شاید میں نے کوئی غلطی کی ہو۔ میری کیلکولیشن چیک کر لیں۔''

''میں نے صحیح طرح سے دیکھا ہے۔ سارے سوال ٹھیک ہیں۔ اب تم وہ پوچھو جو تم سے ہو نہیں پا رہے۔'' وہ اس بچکانہ انداز پر مسکراتے ہوئے بولا۔

اسی وقت توفیق کمال بھی آ گئے تھے۔

''ان محترمہ کو کچھ چیزیں سمجھنا تھیں۔ میں نے سوچا کہ فون پر اتنی لمبی بات کرنے سے بہتر ہے کہ خود ہی آ جاؤں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ایمن کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں ابھی لاؤنج میں داخل ہوتے وقت میں نے سنا تھا' ڈیپریسیشن چارج اور بک ویلیو کی کچھ بات ہو رہی تھی۔'' وہ خاموشی سے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

''تم نے حیدر سے چائے' کافی کو پوچھا؟'' وہ اچانک اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''جی وہ۔'' وہ ان کے سامنے بول کیوں نہیں پاتی۔

اسے خود پر سخت غصہ آیا۔

''پوچھا تھا ایمن نے۔ میں نے منع کر دیا۔ ابھی تو ایک ڈنر سے آ رہا ہوں' چائے کافی کسی چیز کا موڈ نہیں ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا۔

''میں چلتا ہوں۔ تم لوگ اپنی گفتگو جاری رکھو۔'' وہ متانت سے کہتے ہوئے چلے گئے تھے۔

''آپ کو ان سے ڈر نہیں لگتا؟'' ان کے جاتے ہی اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ڈر؟ کیوں بھئی توفیق بھائی کوئی جن بھوت تو نہیں جن سے ڈرا جائے۔ اچھے خاصے ہینڈسم ہیں۔'' فائل دوبارہ ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے کہا۔

''مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔ میں شاید ان سے کبھی بھی بات نہیں کر سکتی۔''

''کن سے؟'' اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

''کن سے بھئی؟ نام لے کر بتاؤ کس کی بات کر رہی ہو۔ یہ ان سے 'ان' سے کیا ہوتا ہے۔'' اس کی آواز میں اب غصہ اور ناپسندیدگی بھی شامل ہو گئی تھی۔ وہ اس سے نظریں چرا کر یک دم خاموش ہو گئی تھی۔

''تمہاری یہ بات مجھے بالکل اچھی نہیں لگی۔'' اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی ناراضی کا واضح اظہار کیا۔

''مجھ سے بولا ہی نہیں جاتا۔ میں نے کبھی ان کے لیے ایسا کوئی لفظ استعمال ہی نہیں کیا۔''

''نہیں کیا تو اب کر دو اور بولا کیوں نہیں جاتا' تم ابھی میرے سامنے بولو۔'' وہ ڈپٹنے والے انداز میں بولا۔

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

''کیا کہہ رہا ہوں میں تم سے ایما؟'' اس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔

''میں اب انہیں پاپا بولا کروں گی۔ لیکن اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس لفظ کے بولنے سے انہیں کو
پڑے گا یا یہ کہ میں ان سے قریب ہو جاؤں گی تو یقین کریں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔
آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کی گود میں گرے۔

''جاؤ پانی پی کر اور منہ دھو کر آؤ۔'' وہ ٹشو سے اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھی۔ اس کے کہنے پر وہ فو
سے اٹھ گئی' پانچ منٹ بعد واپس آئی تو وہ پہلے والے موڈ میں اسے سوالات سمجھانے لگا تھا۔

''بہت جلدی بات سمجھ لیتی ہو تم۔'' وہ آدھے گھنٹے میں اس کے دس اٹکے ہوئے سوالات کے حل بتا
بعد مسکراتے ہوئے بولا۔

''تمہاری جگہ کوئی عام اسٹوڈنٹ ہو تو اتنی مشکل بات اتنی آسانی سے نہیں سمجھ سکتا۔ تمہارے ساتھ مح
کرنی پڑتی۔'' صوفے پر سے اٹھتے ہوئے اس نے اس کی تعریف کی' وہ اس کی تعریف پر قصداً مسکرائی۔

''تمہاری ہنسی جتنی خوب صورت ہے۔ تمہارا رونا اتنا ہی بدصورت ہے' تم روتے ہوئے بالکل ا
لگتیں۔'' اپنا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے وہ مسکرا کر بولا۔

* * *

اسے ایگزامز سے فارغ ہوئے دوسرا دن تھا جب صبح صبح حیدر کا فون آ گیا۔

''چھٹیوں میں کیا کر رہی ہو؟'' سلام دعا کے بعد اس نے پوچھا۔

''ابھی تو امتحان کی تھکن اتار رہی ہوں۔'' اس نے بے فکری سے جواب دیا۔

''تھکن اتارنے کے لیے دو دن کافی ہیں۔ اب جولائی کے آخر میں تمہاری کلاسز شروع ہوں گی
دن گھر پر فارغ رہ کر کیا کرو گی۔ IBA والے بزنس کمیونیکیشن کا شارٹ کورس کروا رہے ہیں۔ وہاں ایڈم
لو۔ آج ہی ڈرائیور کو بھیج کر فارم منگوا لو۔'' وہ اس کے اس نئے حکم پر سٹپٹائی تھی۔

''لیکن۔''

''لیکن ویکن کچھ نہیں' آپ وہاں سے کورس کر رہی ہیں۔ یہ میرا آپ کو مشورہ نہیں حکم ہے۔'' اس
ٹوک انداز میں کہتے ہوئے بات ختم کر دی تھی۔

اس نے فارم جمع کروا دیا تو حیدر نے جیسے سکون کا سانس لیا۔ ''تم گھر پر فارغ رہ کر اوٹ پٹانگ
سوچتیں' اس لیے میں نے یہ کورس کرنے کو کہا ہے۔ پھر وہاں جانے میں تمہارا فائدہ ہے۔ تم بہت کچھ سیکھو گی۔

ہفتے میں تین دن اس کی کلاسز ہوتی تھیں۔ جس روز اس کی پہلی کلاس تھی اس نے ناشتے کی میز
مشکلوں سے خود میں اتنی ہمت پیدا کی تھی کہ توفیق کمال کو اپنے کورس کے متعلق بتا سکے۔

''ویری گڈ۔'' انہوں نے میز پر اٹھتے ہوئے سرسری سے انداز میں شاباشی دے دی۔

''اچھی بات ہے۔ گھر پر فارغ رہنے سے کچھ سیکھ لینا اچھا ہے۔'' اس مختصر سی گفتگو کے فوراً بعد و

روم سے نکل گئے تھے۔

اتنے مہینے یونیورسٹی جاتے رہنے سے اس میں تھوڑا بہت اعتماد آ گیا تھا اسی لیے وہ کورس اٹینڈ کرتے ہوئے اتنا نہیں گھبرائی تھی جتنی خود اسے توقع تھی۔ ہاں وہ اس وقت بہت گھبرائی تھی جب پانچویں کلاس میں ان کے ٹیچر نے انہیں پبلک اسپیکنگ سے متعلق تمام اہم نکات سمجھانے کے بعد تمام اسٹوڈنٹس کو اگلی کلاس میں ساری کلاس کے سامنے تقریر کرنے کے لیے کہا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر نروس ہوتی رہی کہ یہ تقریر اس کے بس کی بات نہیں۔

لیکن وہ بولی تھی۔ اپنے اس یقین کے باوجود کہ میں ایک لفظ بھی نہیں بول پاؤں گی وہ بولی تھی۔ اس ایک مہینے کے کورس میں اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ بہت سے نئے لوگوں سے ملی تھی۔ وہ بزنس رائٹنگ اور اورل کمیونیکیشن کی بہت ساری ٹیکنیکس سے واقف ہوئی تھی۔

* * *

چھٹیوں کے بعد یونیورسٹی میں ان لوگوں کے سیکنڈ سمسٹر کی کلاسز شروع ہوئی تو تب تک ان لوگوں کو اپنے دو سبجیکٹس کے مارکس پتا چل چکے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی کہ اس کے لیلیٰ اور فراز کے نمبروں میں خاص فرق نہیں تھا۔ لیلیٰ اور فراز اس کی کلاس کے دو بہترین اسٹوڈنٹ تھے۔

وہ آفس میں اپنی میز کے آگے بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا جب اس کے موبائل پر ایمن کی کال آئی۔ وہ کال ریسیو کرنے سے پہلے اس کی آواز سننے کی توقع نہیں کر رہا تھا کیونکہ موبائل پر آنے والا نمبر توفیق کمال کے گھر کا نہیں تھا۔

’’کہاں سے فون کر رہی ہو؟‘‘ وہ اس کی آواز سنتے ہی بولا۔

’’یونیورسٹی سے گھر پہنچنے تک میں صبر کر ہی نہیں سکتی تھی۔‘‘ وہ خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

’’کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں نے کیوں فون کیا ہے۔ وہ بھی صبح گیارہ بجے اور یونیورسٹی سے؟‘‘ وہ اپنی خوشی کسی بھی طرح چھپا نہیں پا رہی تھی۔

’’نہیں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم ہی بتا دو۔‘‘ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی مگر لہجہ مکمل طور پر سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔

’’میری فرسٹ پوزیشن آئی ہے۔‘‘ خوشی اور ایکسائٹمنٹ کی وجہ سے اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

’’اچھا؟‘‘ وہ حیران ہوا۔ ’’ایسا کیسے ہو گیا۔ میں تو اپنے سارے اندازوں اور پیشن گوئیوں پر شرمندہ ہونے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔‘‘ وہ بڑی سنجیدگی سے اسے چھیڑ رہا تھا۔

’’دو سبجیکٹس کے مارکس آنے رہ گئے تھے۔ وہ ابھی ابھی پتا چلے ہیں اور ان دونوں میں میرے مارکس سب سے زیادہ ہیں۔ دوسری پوزیشن لیلیٰ کی آئی ہے۔ اس کے مجھ سے پانچ نمبر کم ہیں۔‘‘ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ لینے کے باوجود باتیں کرنے کے موڈ میں تھی۔

’’کتنی پرسٹیج بنی تمہاری، رٹے لگانے کے بعد اتفاقاً پوزیشن لے آنے پر۔‘‘ وہ اتنی آسانی سے اسے بخشنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

یونیورسٹی سے گھر آنے کے بعد اس نے منہ ہاتھ دھو کر صرف کپڑے ہی بدلے تھے کہ وہ آ گیا۔ اس کے اندر آنے سے پہلے وہ خود بھاگتی ہوئی باہر پورچ میں آ گئی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر موجود خوشیوں کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

’’چلو کہیں باہر لنچ کر کے اس خوشی کو سیلیبریٹ کرتے ہیں۔‘‘ اس کے کہنے پر وہ فوراً گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

’’کیسا لگ رہا ہے؟ اب یقین آ رہا ہے میری باتوں پر یا ابھی بھی نہیں آ رہا؟‘‘ گاڑی مین روڈ پر ڈالتے ہوئے اس نے پوچھا۔

’’ابھی تو میں حیران ہو رہی ہوں۔ مجھے واقعی یقین نہیں آ رہا۔ کلاس میں بھی سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ بعض لڑکے تو میرا نام بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ ام ایمن کون سی لڑکی ہے۔‘‘ وہ جوش و خروش سے اسے آج یونیورسٹی میں ملنے والے اعزازی سلوک کی تفصیلات سنا رہی تھی۔

’’کبھی میرے تعریف کرنے پر ایسے خوش نہیں ہوئیں۔ کوئی دوسرا تعریف کرے تو یقین آتا ہے، میں کروں تو وہ جھوٹی اور دل رکھنے والی تعریف ہوتی ہے۔‘‘ اس نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

’’تمہارا گفٹ میں بھولا نہیں ہوں۔ کل دوں گا تمہیں گفٹ۔‘‘ لنچ کرتے ہوئے اس نے ایمن سے کہا۔ اس نے سوفٹ ڈرنک کے سپ لیتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔ خوشی کی زیادتی نے بھوک پیاس سب اڑا دی تھی۔ وہ لنچ کرتے ہوئے حیدر سے سارا وقت ’’میں بہت خوش ہوں، مجھے بالکل بھی یقین نہیں آ رہا۔‘‘ کہتی رہی تھی اور و اس کی بچکانہ سے انداز میں کہی جانے والی ان باتوں کو انجوائے کرتا رہا تھا۔

* * *

ہیئر ڈریسر کے ہاتھ بڑی مہارت اور احتیاط کے ساتھ اس کے بالوں کی کٹنگ میں مصروف تھے۔ و یونیورسٹی سے آ کر کھانا کھانے کے بعد سونے کا ارادہ رکھتی تھی کہ حیدر کا فون آ گیا۔

’’میں تمہیں تمہارا گفٹ دینے آ رہا ہوں۔ میں آفس سے نکل چکا ہوں، اس وقت راستے میں ہوں۔‘‘ د منٹ بعد وہ گھر پر موجود تھا۔

’’جلدی سے گاڑی میں بیٹھو۔‘‘

’’آپ تو گفٹ دینے آئے ہیں؟‘‘ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

’’وہ گفٹ ایسا ہے کہ چل کر تمہارے پاس نہیں آ سکتا، تمہیں خود اس کے پاس جانا پڑے گا۔‘‘ وہ متجسس ک گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اس نے گاڑی اس بیوٹی سیلون کے سامنے لا کر روکی اور اس کے چہرے پر چھائی حیرت اور استعجاب کو نظ انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

’’یہ ہے تمہارا گفٹ۔‘‘ وہ اپنے والٹ سے پیسے نکالنے لگا۔

’’آپ یہ بیوٹی سیلون مجھے گفٹ کر رہے ہیں؟‘‘ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں پوچھا تھا۔

’’جا کر اپنے بالوں کی کٹنگ کرواؤ اور بھی جو کچھ کروا سکتی ہو کرواؤ۔‘‘ اس نے ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس ک طرف بڑھا دیے تھے۔

''آپ کیا خیال ہے میں یہ سب کچھ کروالوں۔ تو میں اچانک خوب صورت نظر آنے لگوں گی کیا خوب صورت نظر آنا اتنا ضروری ہے؟ آپ کہتے ہیں میں ذہین ہوں' اگر میں واقعی ذہین ہوں تو کیا صرف میرا ذہین ہونا مجھے اچھا ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔'' اسے حیدر کی بات بہت بری لگی تھی۔

''خوب صورتی سے متاثر ہونا ہم انسانوں کی فطرت ہے ایما! ہم خوب صورتی سے متاثر ہوتے ہیں' ہمیں خوب صورت چیزیں اچھی لگتی ہیں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم خوب صورتی سے متاثر نہیں ہوتیں۔ تمہیں بارش' تتلیاں' پھول' ہرے بھرے درخت یہ سب اسی لیے اچھے لگتے ہیں کہ وہ خوب صورت ہوتے ہیں۔ خوب صورت چیزوں ہی کی طرح ہم خوب صورت انسانوں سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔

صرف عورتوں ہی کے لیے نہیں میں مردوں کے لیے بھی بات کر رہا ہوں۔ یہ ہر انسان کا حق ہے خود اس کی اپنی ذات پر کہ وہ خود کو اچھی طرح رکھے۔ دیکھو یہ انسانی فطرت ہے' اور میں اس بات میں کوئی برائی نہیں سمجھتا۔'' وہ اس کی ناراض شکل کو دیکھ کر سنجیدگی سے اسے سمجھانے لگا تھا۔

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن۔'' وہ اپنے انکار کے لیے کچھ مناسب قسم کے الفاظ تلاش کرنے لگی تھی۔

''شاید نہیں میں یقیناً ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تمہیں اگر مجھ پر بھروسہ ہے تو۔'' اس نے بات بھروسہ کی کی تھی اور وہ اس شخص سے بڑھ کر کسی پر بھی بھروسہ نہیں کرتی تھی۔ اس نے اس کے ہاتھ سے پیسے لے لیے تو وہ مطمئن سے انداز میں مسکرایا۔

''میں واپس آفس جا رہا ہوں۔ جس وقت فارغ ہو جاؤ تو مجھے فون کر دینا میں تمہیں لینے آ جاؤں گا'' اور اب اس وقت اپنے بالوں کی کٹنگ کرواتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اپنی سوچ کے برعکس اور اپنی مرضی کے خلاف کوئی بھی کام صرف اس کے کہہ دینے پر کرنے کے لیے کیوں تیار ہو جاتی ہے؟ حیدر کو فون کرنے کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر خود کو آئینے میں دیکھا۔ وہ خود اپنے آپ کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔

''یہ میں ہی ہوں؟'' اس نے حیرت سے خود کو دیکھا۔

حیدر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس سے بولا۔

''تم نے خود کو آئینے میں دیکھا؟'' اس نے سر اثبات میں ہلایا تو وہ سر ہلانے والی اس کی مخصوص عادت پر ہنستے ہوئے مزید بولا۔

''کیسی لگیں تم خود کو؟''

''آپ کو کیسی لگی؟'' بجائے اس کی بات کا جواب دینے کے اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''ایسی کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کل ہی تمہارا کوئی ہینڈسم سا کلاس فیلو تمہیں پرپوز نہ کر دے۔'' وہ اس جواب پر بے اختیار مسکرائی تھی۔

''آپ خوبصورتی سے متاثر ہوتے ہیں؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''بالکل ہوتا ہوں۔'' اس نے بغیر ہچکچائے اعتراف کیا۔

''میں لڑکیوں کی بات کر رہی ہوں' آپ خوبصورت لڑکیوں سے متاثر ہوتے ہیں۔'' وہ اس سوال پر قہقہہ لگا

کر ہنس پڑا تھا۔

''ہوتا ہوں بھئی میں اچھا خاصا حسن پرست ہوں۔''

''پھر آپ کے آفس میں کام کرنے والی سب لڑکیاں بہت خوبصورت ہوں گی۔ خاص طور پر آپ
سیکرٹری۔'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس کے سوالات کو انجوائے کرتا ہوا مسلسل ہنس رہا تھا۔ ''میر
سیکرٹری بہت خوبصورت ہے۔ ویسے اسے میں نے نہیں میرے پاپا نے اپائنٹ کیا تھا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا تھا۔

* * *

توفیق کمال اور الماس سے اس کی ملاقات رات کے کھانے پر ہوئی تھی۔ وہ دونوں پچھلے دو دنوں سے اس
آباد گئے ہوئے تھے۔ شام کو سات بجے کے قریب ان دونوں کی واپسی ہوئی تھی۔ الماس نے اس کی تبدیلی کو
نوٹ کیا تھا۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو ایمن! کہاں سے کٹنگ کروائی؟'' چونکے تو توفیق کمال بھی تھے' لیکن انہوں
کہا کچھ نہیں تھا۔

اس نے ان کی تعریف پر ''شکریہ'' کہا۔ الماس کے بارے میں منفی انداز میں سوچتا اب اس نے چھوڑ
تھا۔ وہ اب یہ سوچنے لگی تھی کہ اگر الماس نہ ہوتیں تو کوئی اور ہوتی۔ یہ بات طے تھی کہ توفیق کمال کی زندگی میں
زینب بشیر کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

''میرا رزلٹ آ گیا ہے.....؟'' ہمیشہ کی طرح ڈرتے ہوئے وہ یہ بات بتا پائی تھی۔

انہوں نے فرائیڈ مشروم کھاتے ہوئے پوچھا۔ ''اچھا..... کب آیا؟''

''کل.....''

''ہو گئے سارے پیپرز کلیئر؟'' ان کے اس سوال نے اس کے سارے جوش و خروش کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ اس
کے باپ کو اس سے یہ امید بھی نہیں تھی کہ وہ سارے پیپرز کلیئر کر لے گی۔ ''جی.....'' اس نے ان کی طرف دیکھے
بغیر پلیٹ پر نظریں جمائے ''جی'' کہا۔

آگے کوئی بات بتانے کا اب اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

''ویری گڈ...'' انہوں نے اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے یہ دو الفاظ ادا کیے۔

''اس سمسٹر کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟''

''نہیں۔'' اس مختصر سی گفتگو کے بعد وہ الماس کے ساتھ اپنے بزنس افیئرز ڈسکس کرنے لگے تھے۔

''اگر تم نہیں ہوتے تو میں اپنی خوشیاں اور اپنے آنسو کس کے ساتھ شیئر کرتی۔'' اپنے کمرے میں آ کر اس
نے حیدر مسعود کے تصور سے کہا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ پھر بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

* * *

بی بی اور الماس ایک ساتھ شاپنگ کرنے گئی تھیں۔ سات بجے کے قریب اسے رشیدہ سے بی بی کے آنے
کے بارے میں پتا چلا تو وہ کمپیوٹر بند کر کے ان سے ملنے آ گئی۔

"حیدر امریکہ جانے والا ہے۔ ماریہ اور بچوں کے لیے کچھ چیزیں بھیجنا چاہ رہی تھی۔ میں نے سوچا اکیلے شاپنگ سے بہتر ہے الماس کے ساتھ پروگرام بنا لوں۔"

الماس نے بی بی کو کھانے پر روک لیا تھا۔ توفیق کمال کسی ڈنر میں گئے ہوئے تھے

"آپ سیما بھابھی کے فون کا ذکر کر رہی تھیں۔ وہ بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔" الماس کو کھانا کھاتے ہوئے نجانے اپنی اور بی بی کی ادھوری رہ جانے والی کون سی بات یاد آ گئی تھی۔

"میں اس کی آواز سن کر حیران رہ گئی۔ ہم سب کی خیریت ایسے پوچھ رہی تھی جیسے ہمارے بیچ وہی پرانے والے تعلقات ہیں۔ کہنے لگی کہ حیدر اور جمیلہ کا رشتہ ختم ہو جانے سے ہمارے باقی رشتے ختم تو نہیں ہو گئے۔ میں حیدر اور ماریہ کی سگی ہوں، ہمارا خون کا رشتہ ہے۔ بہت مضبوط اور کبھی ختم نہ ہونے والا۔"

بی بی کی سنجیدگی سے بتائی جانے والی اس بات نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ ان دونوں کی گفتگو سے زیادہ کھانے میں دلچسپی لے رہی تھی اور اب جمیلہ بابر کے ذکر کے بعد کھانے سے زیادہ اسے ان کی باتوں میں دلچسپی تھی۔ الماس کھانا روک کر بڑے حیرت بھرے انداز میں بی بی کی باتیں سن رہی تھیں۔

"سیما بھابھی کو چار سال گزارنے کے بعد اچانک خونی رشتے کیسے یاد آ گئے؟" ان کا لہجہ طنزیہ سا تھا۔

"جمیلہ کی علیحدگی ہو گئی ہے اپنے دوسرے شوہر سے۔ خود طلاق لی ہے اس نے اس آدمی سے۔ اب تو طلاق ہوئے بھی ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے۔

میرے پوچھے بغیر سیما خود ہی ساری تفصیلات بتا رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ جمیلہ حیدر سے طلاق لینے پر اب بہت پچھتا رہی ہے۔ حیدر سے الگ ہونے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ اسے کتنی شدید محبت کرتی ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ لندن سے ہی فون کیا تھا سیما نے۔ کافی دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ جمیلہ کی طرف سے معافیاں، اب حیدر کو کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ جمیلہ نے خود کو بالکل بدل لیا ہے وغیرہ۔ مختصراً یہ وہ لوگ یہ رشتہ دوبارہ جوڑنا چاہتے ہیں۔" بی بی نے تفصیل سے بتایا۔ الماس بڑی حیرت سے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ ان کے لیے یقیناً یہ اطلاعات نئی تھیں۔

"آپ نے کیا کہا ان سے؟"

"میں کیا کہتی۔ اب کہنے کو کچھ بچا ہی کہاں ہے۔ کتنے ارمانوں سے ہم جمیلہ کو بیاہ کر لائے تھے۔ اس نے اپنا گھر بسانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں نے تو آخری وقت تک بھی کوشش کی تھی کہ طلاق نہ ہو۔ اپنی بے جا ضد چھوڑ کر اپنے رویے میں تھوڑی لچک پیدا کر لے مگر وہ کچھ سننے اور سمجھنے پر آمادہ ہی نہیں تھی۔"

بی بی کے لہجے میں افسردگی کی واضح جھلک تھی۔

"آپ نے حیدر کو بتایا سیما بھابھی کے فون کے بارے میں؟" الماس نے بریانی کی ڈش بی بی کے آگے رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بتایا تھا..... اس نے نہ کسی حیرت کا اظہار کیا نہ غصے کا۔ میں اسے تفصیل سے سیما کی ساری باتیں بتانے لگی تو اس نے تھوڑی سی بات سننے کے بعد ہی 'بی بی میں بور ہو رہا ہوں، پلیز کسی اور ٹاپک پر بات کریں۔' کہہ

کر مجھے چپ کروا دیا۔ میں نے جب اس بات پر غصے کا اظہار کیا کہ وہ میری بات میں دلچسپی کیوں نہیں لے
پتا چلا کہ اسے یہ سب کچھ کافی پہلے سے معلوم ہے۔ حیدر سے مایوس ہونے کے بعد ہی سیما نے مجھے فون کیا ہے۔"

"بہت رازداری برتنے لگا ہے حیدر۔ ہم میں سے کسی کو خبر کیا بتاتا اس نے آپ سے بھی ذکر نہیں
چھ سات مہینوں سے اتنی بڑی بات چھپائے بیٹھا ہے۔" الماس نے ان کی بات پر سنجیدگی سے تبصرہ کیا۔

"رازداری ہے یا جو بھی ہے لیکن مجھے حیدر کی یہ عادت سخت ناپسند ہے۔ اب مجھ سے بھی اگر وہ اپنی با
شیئر نہیں کرے گا تو پھر کس سے کرے گا۔ میرے ناراض ہونے پر جھٹ ہنستے ہوئے لاپروائی سے کہنے لگا۔

"آپ کو ذرا ذرا سی بات پر ٹینشن لینے کی عادت ہے۔ جب کہ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہماری زندگی
نکل چکے ہیں، ان کے متعلق سوچنا اور پریشان ہونا انتہائی فضول کام ہے۔" پھر میری ناراضی دیکھ کر اس نے سنجی
سے جمیلہ اور سیما کی فون کالز کے بارے میں بتایا۔

"حیدر جیسا شاندار مرد جس عورت کو ملے اور وہ اس کی قدر نہ کرے اسے پھر یونہی پچھتانا چاہیے۔ اب ا
کے پیچھے آ رہی ہے۔ معافیاں مانگ رہی ہے، تب تو اسے حیدر بہت کنزرویٹو لگتا تھا۔" الماس نے جمیلہ کے
اپنی ناپسندیدگی کا کھل کر اظہار کیا۔

"ویسے حیدر نے اپنی شادی کے بارے میں آخر کیا سوچا ہے۔ میں پوچھتی ہوں تو بات ہنسی مذاق میں
کر دیتا ہے۔ میرے حساب سے اب اسے شادی کر لینی چاہیے۔" انہوں نے بی بی کی طرف سوالیہ نگاہوں
دیکھا۔

"میں تو کہہ کہہ کر تھک گئی ہوں۔ مگر وہ میری بات پر دھیان دے تب نا۔ اب پہلی شادی ناکام ہو گئی ہے ا
کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دوبارہ شادی کے بارے میں سوچا ہی نہ جائے۔ مجھے تو اب ایسا لگنے لگا ہے کہ میں ا
کے بچوں کو کھلانے کی حسرت لیے ہی اس دنیا سے چلی جاؤں گی۔"

"اللہ نہ کرے، کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ بی بی! ابھی آپ کو بہت سال زندہ رہنا ہے۔ اب یہ بندہ
مشکل ہے کہ کوئی عام لڑکی تو اسے متاثر کر ہی نہیں سکتی لیکن آپ فکر مت کریں کہیں نہ کہیں تو ہو گی وہ خاص لڑ
جو اس کے معیار پر پوری اترے گی۔" الماس نے مسکراتے ہوئے ان کی بات کا جواب دیا تو وہ بھی ج
مسکرائیں۔

"ہماری باتیں ایمن کو بور کر رہی ہیں۔ ہم اپنی باتوں میں لگ گئے اور وہ اتنی دیر سے چپ بیٹھی ہے۔" بی
ایک دم ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

"نہیں میں بور نہیں ہو رہی۔" اس کے ذہن میں خاص لڑکی کا لفظ گردش کر رہا تھا لیکن پھر بھی اخلاقاً مسکر
تھی۔ بی بی نے اب اس سے باتیں شروع کر دی تھیں۔

* * *

"تمہاری فرسٹ پوزیشن آئی ہے، تم نے بتایا بھی نہیں۔" انہیں یہ بات کہاں سے پتا چلی ہو گی، وہ جانتی
اسی لیے چونکی نہیں تھی۔ الماس نے بھی چونک کر اخبار سے نظریں اٹھائیں۔

"مجھے یاد نہیں رہا۔" شکوے شکایت کرنے والا کوئی حق اس کے پاس تھا ہی نہیں۔ شرمندہ سے لہجے میں سر جھکا کر وہ یہی جواب دے سکی۔

وہ شاید ابھی اس بارے میں مزید کوئی بات کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اسی وقت ان کے موبائل پر کال آ گئی۔ یہ کال نہ آتی تو شاید وہ اسے ایک آدھ جملہ عنایت کر دیتے۔ الماس نے البتہ اسے بڑی گرم جوشی سے مبارک باد دی تھی۔

"بہت مبارک ہو ایمن! اتنی خوشی کی خبر اتنے دنوں سے چھپائے بیٹھی ہو۔" اس نے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے انہیں "تھینک یو" کہا۔

اس کے پاس اب سوچنے اور کرنے کے لیے دوسرے بہت سے کام تھے۔ فرسٹ سمسٹر میں آنے والی پہلی پوزیشن کو اسے برقرار رکھنا تھا۔ اس کے لیے اب وہ پچھلے سمسٹر سے بھی زیادہ محنت کر رہی تھی۔ اس کے لیکچرز اور اس کے نوٹس کی کلاس میں بہت اہمیت ہو گئی تھی۔

* * *

اس کے تھرڈ سمسٹر کی پڑھائی شروع ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر نقوی نے ان لوگوں کو اسائنمنٹ دیا تھا۔ امریکہ سے Ph.D کر کے آئے ہوئے اپنے ان پروفیسر کو وہ نئے سمسٹر کے آغاز ہی میں اپنی کارکردگی سے متاثر کرنا چاہتی تھی۔

بعض چیزوں کے بارے میں وہ حیدر سے مدد لینا چاہتی تھی اور اسی لیے اس رات اس نے حیدر کو فون کیا تھا۔ "قصہ مختصر یہ کہ ساری محنت ڈاکٹر صاحب کو متاثر کرنے کے لیے کی جا رہی ہے۔ وہ نئے سمسٹر کی ابتدا ہی سے مس ام ایمن کی ذہانت اور قابلیت سے بری طرح امپریس ہو جائیں۔ تمہیں اپنی تعریفیں سننے کا زیادہ شوق نہیں ہوتا جا رہا؟" وہ اسے شرارتی سے لہجے میں چھیڑ رہا تھا۔

"کیا برائی ہے اس میں۔ اپنی تعریف کسے بری لگتی ہے۔ تعریف سننا ہر ایک کو اچھا لگتا ہے۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔ اب یہ فرمایئے کہ میری خدمات آپ کو کب درکار ہیں۔ کیونکہ اتنی لمبی چوڑی تفصیلات فون پر نہیں ہو سکتیں۔" وہ جواباً گویا ہوا۔

"میں کل شام کو آپ کے گھر آ جاتی ہوں۔"

اس نے جلدی سے کہا۔

"کل تو ناممکن ہے' کل رات آٹھ بجے کی فلائیٹ ہے۔ استنبول جا رہا ہوں میں۔"

"اوہ۔" وہ تھوڑی مایوس ہوئی تھی۔ "واپس کب آئیں گے؟"

"شاید ایک ہفتہ لگ جائے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"تب تک اسائنمنٹ جمع کرانے کی ڈیٹ بھی گزر چکی ہو گی۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"تم کل یونیورسٹی سے میرے آفس آ جاؤ۔ ڈیڑھ سے ڈھائی کا لنچ ٹائم ہو گا۔ اس دوران میں اپنا کوئی اپائنٹمنٹ نہیں رکھوں گا۔ ایک گھنٹہ کافی ہے نا تمہارے مسئلے کے لیے؟" اس نے فوراً ہی یہ حل پیش کیا وہ جواب میں فوراً کچھ نہیں کہہ سکی۔ وہ صرف حیدر مسعود کا آفس تو نہیں تھا۔ وہاں توفیق کمال اور الماس توفیق بھی تو ہوں گے۔ وہ آفس جاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

"لیکن میں....."

"کوئی لیکن نہیں' تم کل آفس آ رہی ہو۔ پھر اگر تمہارے اسائنمنٹ اچھا نہیں بنا اور ڈاکٹر نقوی تم سے امپریس نہیں ہوئے تو تم سارا الزام میرے سر ڈال دو گی کہ میں نے مدد نہیں کی تھی اس لیے تم ڈاکٹر صاحب کو متاثر کرنے کے لیے۔ اتنے شاندار موقع سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے مذاق کر رہا تھا۔

"ٹھیک ڈیڑھ بجے پہنچ جانا۔" اس نے فون بند کر دیا تھا۔

* * *

آفس کے بارے میں اس نے جیسا سوچا تھا' وہ اس سے بھی بڑھ کر شاندار تھا۔ وہ چند لمحوں تک آنکھیں حیرت سے واکیے ریسپشن لابی میں کھڑی رہی تھی۔ وہاں کی سجاوٹ بہترین تھی۔

اس کی سیکرٹری کمپیوٹر پر کام کرنے میں خاصی مگن تھی' اس کے قدموں کی آہٹ نے ہلکا سا شور پیدا کیا تو اس کی سیکرٹری سر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور ہوئی۔

"میں ام ایمن ہوں' مجھے....." اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ خیر مقدمی انداز میں مسکراتے ہوئے فوراً بولی۔

"سر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے دائیں سمت اس کی رہنمائی کی۔

"تشریف لایئے محترمہ! ویسے آپ تین منٹ لیٹ ہیں۔" وہ اپنی سیٹ پر سے اٹھا تھا۔

"میں ڈیڑھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے تب پہنچ گئی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا' آفس میں آ کر آپ سے ملنا اتنا مشکل کام ہے۔ لفٹ میں جاؤ۔ اس سے پوچھو۔ اس سے معلوم کرو۔" وہ کرسیوں میں سے ایک پر گرنے والے اسٹائل میں بیٹھ گئی۔ وہ اس کے جواب پر ہنستا ہوا واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"آج گرمی کتنی ہے؟" وہ اب سکون سے اس آرام دہ آفس میں بیٹھی تو یونیورسٹی میں بھگتنے والی گرمی یاد آ گئی۔ "پیاس لگ رہی ہے؟ کچھ پیو گی؟" اس نے پوچھا

"پلیز' پیاس کے مارے برا حال ہے۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"تم منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے لیمن ایڈ منگواتا ہوں۔" اس نے واش روم کی طرف اشارہ کیا تو وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

فریش ہونے کے بعد لیمن ایڈ کا ٹھنڈا یخ گلاس دو تین گھونٹ میں ہی خالی کر گئی۔

"اب جلدی سے پوچھنا شروع ہو جاؤ' تمہیں کیا پوچھنا ہے۔" وہ توقف کے بعد سنجیدگی سے بولا۔ اس نے اپنی فائل کھولی' پین ہاتھ میں لے لیا۔

"آپ لنچ نہیں کرتے؟"

"کرتا ہوں....." وہ اس کے سوال کا مقصد سمجھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”آج نہیں کریں گے؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”کروں گا۔“ اس نے مسکراہٹ دبا کر سنجیدگی سے کہا۔

اچانک اس کی نظر گھڑی پر پڑی تو احساس ہوا کہ وقت کم ہے اور پوچھنا بہت کچھ ہے۔ اس لیے فوراً سنجید ہوگئی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر حیدر تو نہیں البتہ وہ ضرور چونکی تھی۔ ملازم ہاتھوں میں ایک بڑی سی ٹرے اٹھائے اندر آیا تھا۔ ان دونوں پر نظر ڈالے بغیر وہ دوسرے کونے پر رکھے صوفوں کے درمیان میں موجود میز پر کھانا سر کر رہا تھا۔

”آ جاؤ ایما! اب باقی جو کچھ بھی پوچھنا ہے وہ کھانا کھاتے ہوئے پوچھ لو۔“ اپنی سیٹ پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ اتنی دیر سے پیروں میں سینڈلز اتار کر بیٹھی ہوئی تھی۔

اب بھی حیدر کے کہنے پر کرسی سے اٹھی تو سینڈل پہننے کی زحمت کیے بغیر کارپٹ پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے دوسرے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

”وہ کراچی اسٹاک ایکسچینج سے متعلق ملنے والے اپنے اسائنمنٹ کے بارے میں اس سے سوالات کرنے میں مصروف تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز پر حیدر اور وہ دونوں چونکے تھے۔

”مسٹر ولیم کا فون آیا لندن سے؟“ توفیق پوچھ رہے تھے۔

وہ توفیق کمال کو دیکھ کر نروس سی ہوگئی تھی۔

ایمن کو یہاں بیٹھا دیکھ کر بالکل نہیں چونکے تھے۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کا فون آیا تھا۔ بات ہوگئی ہے میری ان سے۔“

حیدر نے ان کے سوال کا سنجیدگی سے جواب دیا۔

”چلو یہ اچھا ہوگیا اس فون کا مجھے بہت انتظار تھا۔“ وہ شاید یہی پوچھنے آئے تھے کیونکہ یہ پوچھتے ہی دروازے کی طرف پلٹے تھے۔

”آپ نے لنچ کرلیا توفیق بھائی؟“ حیدر کے پوچھنے پر انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”فرصت کہاں ملی۔“

”دس منٹ نکال لیں اپنی مصروفیت میں سے۔ کھانا کھانے میں اس سے زیادہ وقت تو نہیں لگے گا۔“ وہ اصرار کرنے لگا تو اس نے حیرت اور رشک سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ کتنی بے تکلفی کے ساتھ وہ توفیق کمال پر روک رہا تھا۔ کیا وہ کسی کو اپنے ساتھ اس بے تکلفی کی اجازت بھی دیتے ہیں؟

”پلیز...... آئیے نا......“ اس کے اتنے زیادہ اصرار پر انہیں اپنے انکار سے دستبردار ہونا ہی پڑا تھا۔ اُ کھانے کے لیے بیٹھتا دیکھ کر اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے تھے۔

”ایما کو اپنے اسائنمنٹ میں کچھ پرابلم تھی۔ میں نے کہا تم آفس ہی آ جاؤ پھر رات کو تو میں ترکی ہوں۔“ وہ انہیں ان کی بیٹی کی یہاں موجودگی کی وجہ سے آگاہ کر رہا تھا اور بیٹی اپنے خوب لمبے اور کار چھوتے ہوئے دوپٹے کے پلو سے اپنے ننگے پیروں کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے یہ دیکھا ہی نہیں تھا کہ اس کی اس حرکت پر ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ اس مسکراہٹ کو انہوں نے فوراً چھپا بھی لیا تھا۔ حیدر نے ایمن کی دوپٹہ والی حرکت کو بھی دیکھا تھا اور توفیق کما مسکراہٹ کو بھی۔

”لنچ کے بعد مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ جلدی پوچھو تمہیں کیا پوچھنا تھا۔“ اس نے سر جھکا کر بیٹھی ایمن سے کہا۔ وہ اب کچھ پوچھتی تو کیا۔ وہ تو کچھ کھا بھی نہیں رہی تھی۔

وہ ایمن کو جواب میں خاموش دیکھ کر خود ہی کراچی اسٹاک ایکسچینج کی مجموعی صورتِ حال پر تبصرہ کرنے لگ اس بارے میں اسائنمنٹ ہی کی وجہ سے اس نے اتنی زیادہ اسٹڈی کی تھی کہ ۱۹۹۸ء سے لے کر ۲۰۰۲ سالوں کے دوران سارے اعداد و شمار اسے زبانی یاد تھے اور حیدر کے غلط تعداد بتانے پر بے اختیار اس سے صحیح جواب نکلا تھا۔

”دیکھیں توفیق بھائی! اس نے پچھلے پانچ سالوں کی کراچی اسٹاک ایکسچینج کی ساری ہسٹری حفظ کر ہے۔ مجھے آپ کی اس جینئس بیٹی سے ڈر لگتا ہے اس کے رٹے اتنے زبردست ہوتے ہیں، مجال ہے figure اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔“ وہ سر جھکا کر اپنی پلیٹ میں پالک پنیر ڈالتے ہوئے سوچ رہی تھی ک مسعود کے کہنے پر آج اسے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ اگر سر اٹھا کر توفیق کمال کی طرف دیکھ لیتی تو اس پل ان کے چہرے پر موجود فخریہ مسکراہٹ نظر آ جاتی۔

”یہ فائل دیکھیں نا۔“

انہوں نے اپنی پلیٹ میز پر رکھ کر فائل حیدر کے ہاتھ سے لے لی تھی۔ دو چار سیکنڈز اس پر نظریں دوڑ کے بعد انہوں نے فائل بند کر کے دوبارہ میز پر رکھ دی۔

”ایما کی ہینڈ رائٹنگ آپ سے کتنی ملتی ہے۔ آپ نے نوٹ کی یہ بات توفیق بھائی۔“ وہ چکن کا باؤل ا طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”ہاں، پہلی نظر میں تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں اپنا ہی لکھا ہوا پڑھ رہا ہوں۔“ نوالہ اس کے حلق میں پھنسا حیدر نے جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”یہ کسی کی تعریف بھی کرتے ہیں؟ اور کسی بھی کون ام ایمن......“

وہ اس کی حیرت سے بے نیاز ایک بار پھر اس سے لاتعلق ہو چکے تھے۔

ان کے جانے کے بعد وہ جیسے اس پر برس پڑی۔

”اتنے فضول لگ رہے تھے آپ ان کے سامنے زبردستی میری تعریفیں کرتے ہوئے۔ بالکل ایسا لگ ر جیسے رشتے کے لیے آنے والوں سے لڑکیوں کی مائیں اپنی پھوہڑ اور بدسلیقہ بیٹیوں کی جھوٹی اور بے تکی تعر کرتی ہیں۔“

”تم مثال تو کچھ ڈھنگ کی دے دیا کرو۔“ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

* * *

سائر توفیق چھٹیوں میں پاکستان آیا تھا۔

الماس نے کئی دن پہلے سے بیٹے کے آنے کی خوشی منانی شروع کر دی تھی۔ وہ پچھلے دو دنوں سے نہ آفس گئی تھیں اور نہ کہیں اور، توفیق کمال سے بھی وہ بزنس یا کسی اور بات کے بجائے صرف اپنے بیٹے ہی کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔

اس نے نوٹ کیا کہ توفیق کمال بظاہر بیٹے کی آمد پر کسی خوشی یا جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے لیکن درحقیقت وہ بھی اس کی آمد پر کافی خوش تھے۔ ان کی بیٹے سے والہانہ محبت اسی بات سے ظاہر ہو رہی تھی کہ آج انہوں نے اپنا ایک اہم بزنس ڈنر بیٹے کی آمد کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔ وہ بیٹے کو ایئر پورٹ لینے خود جا رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹی تو اسے رونا آنے لگا۔ وہ کچھ بھی کر لے کبھی اس لڑکے کی برابری نہیں کر سکے گی۔

صبح توفیق کمال معمول کے مطابق ناشتے کی میز پر موجود تھے جب کہ الماس اور سائر موجود نہیں تھے۔ یونیورسٹی سے دو بجے اس کی واپسی ہوئی تھی۔ سٹنگ روم سے گزرتے ہوئے اسے ڈائننگ روم سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یقیناً کھانا کھایا جا رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ ابھی الماری سے اپنے کپڑے نکال رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”آ جاؤ۔“ وہ یہ سمجھ کر کہ رشیدہ ہو گی بے نیازی سے بولی۔

”السلام علیکم۔“ وہ اس آواز پر بے اختیار چونک کر مڑی۔

”میں اندر آ سکتا ہوں؟“ وہ دروازے کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ توفیق کمال کی جوانی کا مجسم روپ۔

”آ جایئے۔“ وہ خشک سے انداز میں بولی۔ ایک رسمی سی مسکراہٹ بھی اس کے چہرے پر نہیں آئی تھی۔

”میں سائر ہوں۔“ اس کے چہرے پر بے تکلفانہ مسکراہٹ تھی۔

”اور آپ امِ ایمن۔“ وہ بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”بہت شوق تھا مجھے آپ سے ملنے کا۔ بارہ بجے میں سو کر اٹھا تو پتا چلا آپ یونیورسٹی گئی ہوئی ہیں۔ اب بڑی زبردست بھوک لگ رہی تھی۔ آپ آ جائیں پھر ساتھ کھانا کھائیں گے۔ مما کو بھی میں نے بھوکا بٹھایا ہوا ہے۔“

وہ اس بے تکلفانہ اور اپنائیت بھرے انداز سے قطعاً متاثر نہیں ہوئی تھی۔

”آئی ایم سوری، میں آپ کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکوں گی۔ مجھے ابھی نہانا ہے اور ویسے بھی میں نے یونیورسٹی میں سینڈوچز کھا لیے تھے اس لیے اب کھانا شاید ہی کھاؤں۔“ وہ رکھائی سے کہہ کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ باتھ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے ایک نظر مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی کے ساتھ ساتھ دکھ بھی نظر آ رہا تھا۔

وہ سر جھٹکتی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی تھی۔

وہ رات تک اپنے کمرے میں ہی رہی حالانکہ اب وہ پہلے کی طرح سارا وقت کمرے میں نہیں رہا کرتی تھی۔ رات کو کھانے کے لیے وہ ٹیبل پر آئی تو توفیق کمال بیٹے سے اس کی پڑھائی سے متعلق گفتگو کرتے نظر آئے۔ وہ ان کے سوالات کے بہت محتاط ہو کر اور بڑی سنجیدگی سے جواب دے رہا تھا۔ اس کے ان
بے تکلفی نہیں تھی۔ وہ ان سے تھوڑا سا خائف بھی نظر آ رہا تھا۔

الماس، باپ اور بیٹے کی اس گفتگو کے دوران بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔ سب سے پہلے میز پر سے تو
اٹھے تھے۔

ان کے ڈائننگ روم سے نکلتے ہی سائر نے گہری طمانیت بھری سانس لی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں پھیلا کر
پرسکون سا ہو گیا تھا۔

”آپ کو ہمارے کلف لگے پاپا سے ڈر لگتا ہے ایمن؟“ وہ اب سکون سے بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا۔

”سائر۔“ الماس نے تنبیہی انداز میں اسے گھورا۔

”کیا مما! میں ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔ مجھے تو آپ پر اور حیدر بھائی پر رشک آتا ہے جو ان سے اتنی
سے بات کر لیتے ہیں۔“ اس کے انداز میں بچوں جیسی معصومیت تھی۔

”پاپا نے کبھی مجھے نہیں ڈانٹا، ان کا صرف گھور کر دیکھنا ہی میرے لیے کافی ہوتا ہے۔ جی ایمن! جب
براؤن کلر کی بڑی بڑی آنکھوں کو مزید بڑا کرتے ہوئے مجھے گھور کر دیکھتے ہیں تو میرا دل تیز تیز دھڑکنا
جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں حالانکہ میں اور کسی سے بھی نہیں ڈرتا، آپ کہیں پر بھی مجھے کھڑا
وہ بڑے مزے سے کھانا کھاتے ہوئے اس سے مخاطب تھا۔ الماس بیٹے کے اس بچکانہ سے انداز پر مبہم
تھیں۔

”آپ اکنامکس میں ماسٹرز کر رہی ہیں نا؟“ وہ اس کی دوپہر کی بے گانگی کو دیکھ لینے کے باوجود بھی
ساتھ باتیں کرنے کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے جواباً صرف سر ہلایا تھا۔

”سنا ہے فرسٹ پوزیشن لانے کے سلسلے میں آپ نے خاصا اچھا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ آپ کا
آخری سمسٹر ہے اور پچھلے تینوں سمسٹرز میں آپ نے اپنی کلاس میں فرسٹ پوزیشن لی ہے۔“ پتا نہیں
کمال نے یہ بات بتائی تھی یا الماس نے، تکلفاً تھوڑا سا مسکراتے ہوئے اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا
ختم کر چکی تھی اس لیے اپنی پلیٹ ہٹاتے ہوئے کرسی سے اٹھ گئی۔

توفیق کمال اب اس سے اس کی پڑھائی کے متعلق پہلے سے زیادہ گفتگو کرنے لگے تھے اور یہ تبد
اس روز سے آئی تھی جب انہوں نے حیدر کے آفس میں اس کا اسائنمنٹ دیکھا تھا۔ وہ اب اس کے ر
متعلق خود پوچھتے تھے۔ انہوں نے براہِ راست اس سے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی لیکن اسے اندازہ تھا ک
کسی حد تک اپنے باپ کو اپنی ذہانت سے متاثر کرنے میں ضرور کامیاب ہو چکی ہے۔ ماسٹرز کرنے کے
آئی بی اے کے ایوننگ پروگرام میں ایم بی اے کرنے کا ارادہ تھا۔ اپنے اس ارادے کو اس نے حید
ڈسکس کیا تو اس نے اسے بہت سراہا تھا۔ اسے اب اپنے بارے میں یہ یقین تھا کہ وہ IBA کا e
test بڑی آسانی سے کلیئر کر سکتی ہے، نہ صرف ٹیسٹ کلیئر کر سکتی ہے بلکہ وہاں سے نہایت شاندار طر
بی اے بھی کر سکتی ہے۔

* * *

اگلے روز وہ یونیورسٹی سے آئی تو سائر سٹنگ روم میں کھڑا نظر آیا۔

”میں آپ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ مما کو آفس میں کچھ ضروری کام تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے آفس چلی گئی ہیں۔ اکیلے کھانا کھانے کا میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ پلیز آپ کل کی طرح یہ مت کہیے گا کہ یونیورسٹی میں سینڈوچز کھا لیے تھے اس لیے کھانا نہیں کھائیں گی اور اگر کھا بھی لیے ہیں تو بھی میری خاطر ڈائننگ ٹیبل پر آ جائیں۔“ اس کا اس لڑکے سے ایسا کوئی تعلق نہیں تھا جو وہ اس کی خاطر کوئی کام کرتی۔ پتا نہیں اسے ایمن کے چہرے پر موجود بے گانگی اور اجنبیت نظر کیوں نہیں آئی تھی۔

”سائر آپ۔“ اس نے اپنے اندر کی کڑواہٹ پر قابو پاتے ہوئے بے تاثر سا لہجہ اپنانے کی کوشش کی مگر وہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چلا اٹھا۔

”آپ؟ آپ مجھے آپ کہہ رہی ہیں۔ آپ مجھ سے ڈیڑھ سال بڑی ہیں۔ میں تو احترام میں آپ جناب کر رہا ہوں، آپ مجھے کس خوشی میں آپ کہہ رہی ہیں۔“ وہ اس ڈھیٹ لڑکے سے بری طرح چڑ رہی تھی۔ اب یہ لڑکا کیوں بلاوجہ اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔ وہ کسی بداخلاقی یا بدتمیزی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتی تھی اسی لیے کچھ سوچ کر ہاتھ منہ دھو کر اس کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئی۔

”اس گھر میں یہ قدر ہے میری، کسی کو میری کچھ پروا ہی نہیں ہے حالانکہ صرف بیس دنوں کے لیے میں کراچی آیا ہوں پھر بھی نہ پاپا نہ مما اور نہ ہی آپ‘ میری خاطر اپنا روٹین چینج کرنے کو تیار ہیں۔“ کھانا کھاتے ہوئے وہ دکھ بھری شکل بنا کر اس سے بولا۔ وہ اس بات پر کیا کہتی سو خاموشی سے ایک نظر اس پر ڈال کر کھانا کھاتی رہی۔

”حیدر بھائی نے تو بتایا تھا کہ آپ بہت اچھی باتیں کرتی ہیں مگر میں تو جب سے آیا ہوں آپ کو خاموش ہی دیکھ رہا ہوں۔“ حیدر کے ذکر پر اس نے چونک کر سائر کو دیکھا۔ وہ اس کے چونکنے پر مسکرایا۔

”حیدر بھائی بوسٹن آئے تھے۔ تب انہوں نے مجھ سے آپ کے بارے میں بہت ساری باتیں کی تھیں۔ مجھے پتا ہے آپ دونوں کی بہت اچھی دوستی ہے۔ انہوں نے آپ کی بہت تعریفیں کی تھیں مجھ سے‘ وہ آپ کو ایما کہتے ہیں مجھے یہ بھی پتا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری بہن صاحبہ بہت آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ ہیں۔ میں تو ملنے سے پہلے ہی آپ سے امپریس ہو گیا تھا کیونکہ حیدر بھائی یونہی کسی کی تعریف نہیں کرتے۔“ وہ بڑی سادگی سے اسے حیدر کی ساری باتیں بتا رہا تھا۔

”آپ کی اتنی زیادہ تعریفیں سننے کے بعد میرا آپ سے ملنے کو بہت دل چاہنے لگا تھا۔ پتا نہیں آپ نے کبھی کسی بہن یا بھائی کی کمی محسوس کی ہے یا نہیں۔ میں نے تو بہت کی ہے۔ پاپا کی اپنی بزنس کی مصروفیات ہوتی تھیں اور مما سے انڈر اسٹینڈنگ کے باوجود میں بہت سی باتیں ان سے نہیں کر پاتا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کاش میرا کوئی بھائی یا بہن ہوتا تو مجھے گھر میں تنہائی کا احساس تو نہ ہوتا۔ میں نے ماریہ بجو کو دیکھا ہے وہ حیدر بھائی سے کتنا پیار کرتی ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میری بھی کوئی بہن ہوتی تو وہ بھی مجھ سے یونہی پیار کرتی۔“ توفیق کمال کا بیٹا‘ ان کا ولی عہد محبت اور پیار کی باتیں کر رہا تھا۔ اسے بے تحاشا حیرت ہوئی۔ وہ اس بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر

موضوع تبدیل کر کے اس سے اس کی پڑھائی سے متعلق رسمی سے انداز میں گفتگو کرنے لگی تھی۔ وہ ا
موضوع تبدیل کر دینے پر کچھ مایوس سا نظر آنے لگا تھا۔ شاید وہ اس سے اپنی بے تکلفی کے جواب میں ا
بے تکلفی کی امید رکھتا تھا۔ کھانے کے بعد وہ اس سے معذرت کرتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ آنے وا
میں بھی سائر کا اس کے ساتھ یہی انداز رہا تھا۔ اس کے دن کا بیشتر وقت اپنے دوستوں اور رشتے داروں س
ملانے میں گزر رہا تھا لیکن جس وقت بھی وہ گھر پر ہوتا تو الماس کے بعد اس کی توجہ کا مرکز وہی ہوا کرتی ت
رات کو اپنے کمرے میں اسٹڈی کر رہی ہوتی وہ دروازہ تھپتھپا کے اندر آ جاتا۔

”میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ کہتا ہوا صوفے پر بیٹھ جاتا۔ اندر آ جانے کے بعد وہ ڈ
ہونے والی بات پر بھلا کیا کہتی۔ پھر کافی دیر تک بیٹھ کر وہ اس کا سر کھاتا رہتا۔ وہ ہر ممکن حد تک اپنی کوش
رکھتی تھی کہ بظاہر کسی بدتمیزی کا مظاہرہ کیے بغیر اس سے فاصلہ برقرار رکھے۔

ان آٹھ دس دنوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سائر ایک سادہ اور مخلص سا لڑکا تھا۔ اس میں معص
تھی، ابھی تک اس کا بچپن مکمل طور پر رخصت نہیں ہوا تھا۔ اس کے کسی بھی انداز سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھ
امریکہ بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھنے گیا ہوا ہے۔ ان ساری باتوں کے باوجود وہ فاصلہ ہی رکھنا چاہتی تھی۔

آج اس کی یونیورسٹی کی چھٹی تھی اسی لیے وہ تھوڑا دیر سے سو کر اٹھی تھی۔ توفیق کمال اور الماس آفس
تھے اور سائر شاید گھر پر ہی تھا۔ وہ ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں آ کر ابھی کچھ پڑھنے کا موڈ بنا ہی رہی
رشیدہ بھاگی ہوئی اس کے کمرے میں آئی۔

”سائر بابا کو پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ اپنے کمرے میں کارپٹ پر بے ہوش پڑے ہیں۔“ رائٹنگ ٹیبل
کتاب اٹھاتے اس کے ہاتھ بے ساختہ رک گئے تھے۔ رشیدہ سے مزید کچھ پوچھے بغیر وہ تیزی سے کمر
باہر آ گئی تھی۔

”ابھی دس پندرہ منٹ پہلے تو بالکل ٹھیک ٹھاک کھڑے تھے۔ میں کمرے میں ناشتے کا پوچھنے گئی
لگے کہ میں نہانے جا رہا ہوں۔ دس منٹ بعد ناشتہ کمرے ہی میں لے آنا۔ اس وقت تو طبیعت بالکل ٹھیک
رہی تھی۔ مجھ سے انہوں نے بیگم صاحبہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ آفس چلی گئیں۔ پھر آپ کا بھی پوچ
رشیدہ اسے یہ ساری باتیں ہانپتے کانپتے بتاتی رہی تھی۔

اندر آتے ہی وہ سائر کو کارپٹ پر اوندھے منہ گرا دیکھ کر بری طرح ڈر گئی۔ تیزی سے وہ اس کی طرف
اور کارپٹ پر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی۔

”سائر اٹھو۔ کیا ہوا ہے تمہیں۔“ اس کے لمبے چوڑے وجود کو وہ بڑی مشکلوں سے سیدھا کرنے میں ک
ہوئی تھی۔

”سائر آنکھیں کھولو۔“ وہ اس کا چہرہ تھپتھپا رہی تھی مگر اس کے بے حس و حرکت وجود میں ذرا سی بھ
نہیں ہوئی تھی۔ اس کے گیلے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ باتھ روم سے نہا کر نکلتے ہی اسے چکر آ
نہیں کیا ہوا تھا۔

"پانی لاؤ۔" اس نے رشیدہ سے کہا۔ وہ فوراً گلاس میں پانی لے آئی تھی۔

"سائر اٹھو۔" اس کا دل خوف کے مارے تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ وہ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالتے ہوئے اس کے کندھے اور چہرے کو زور زور سے بلا کر اسے آوازیں بھی دے رہی تھی مگر وہ بے خبر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔

"ڈاکٹر کو فون کرو بلکہ تم مت کرو دین محمد سے کہو۔ جلدی سے فوراً جاؤ۔" اس نے چلاتے ہوئے رشیدہ سے کہا۔ وہ فوراً کمرے سے نکل گئی۔

"سائر! تمہیں کیا ہوا ہے۔ پلیز آنکھیں کھولو۔" اسے اس حالت میں دیکھ کر اسے رونا آنے لگا تھا۔

"سائر!"

"جی۔" وہ آنکھیں بند کیے کیے بولا۔ وہ بری طرح چونکی تھی۔

"سائر تم ٹھیک ہو؟" روہانسے لہجے میں اس نے بے یقینی سے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔" مسکراتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ ایک پل کو اس نے حیرت سے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور پھر اگلے پل اس کا غصہ سے برا حال تھا۔ ابھی وہ کچھ کہہ نہیں پائی تھی کہ دین محمد اور رشیدہ ایک ساتھ کمرے میں آئی۔

"میں نے فون کر دیا ہے ڈاکٹر صاحب دس منٹ میں پہنچنے والے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب تک میں آ رہا ہوں اس وقت تک......" دین محمد سائر کو آنکھیں کھول کر لیٹا ہوا دیکھ کر یک دم خاموش ہو گیا۔

"ڈاکٹر صاحب کو ایک کال اور کر دیجیے دین محمد! ان سے کہیے کہ مریض اب بالکل ٹھیک ہے۔" وہ مسکراتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رشیدہ احمقوں کی طرح منہ پھاڑے سائر کو دیکھ رہی تھی جب کہ دین محمد کی سمجھ میں شاید ساری بات آ گئی تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے مسکراتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

"تم بھی جاؤ بھئی میرے لیے ناشتہ لاؤ۔" اس نے اپنے ماتھے پر بکھرے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتے ہوئے رشیدہ سے کہا۔ رشیدہ کے نکلتے ہی وہ بھی ایک جھٹکے سے کارپٹ پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کارپٹ پر بیٹھا کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟ پہلی دفعہ میرے کمرے میں آئی ہیں تھوڑی دیر تو بیٹھیں۔" اسے دروازے کی طرف جاتا دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔ اس نے سر گھما کر ایک نظر سائر کو دیکھا۔ وہ چہرے پر شریر سی مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا غصے سے دماغ کھول رہا تھا مگر وہ اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"اب آپ کتنا بھی غصہ دکھا لیں تھوڑی دیر پہلے آپ یہ بات مجھے بتا چکی ہیں کہ آپ میری پروا کرتی ہیں، اگر مجھے کچھ ہو جائے تو آپ کو فرق پڑے گا۔" وہ تیزی سے اٹھا اور اسے ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر نکلنے سے روک لیا۔ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے زور لگایا۔

"اب اگر آپ جیسی دبلی پتلی نازک سی لڑکی مجھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے میں کامیاب ہو جائے تو میرے لیے تو یہ ڈوب مرنے ہی کا مقام ہوگا۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"دیکھیں، میں مانتا ہوں یہ مذاق تھوڑا سا بے ہودہ تھا مگر میں کیا کرتا۔ میرے واپس جانے میں صر
دن رہ گئے ہیں اور آپ مجھے خود سے قریب ہی نہیں ہونے دے رہی تھیں۔" وہ اسی طرح اس کا ہاتھ
اسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے معصومیت سے بولا۔

"میں حیدر بھائی سے سخت جیلس ہو رہا تھا۔ میری بہن مجھ سے آپ آپ کر کے رسمی انداز میں با
ہے اور حیدر بھائی سے اس کی دوستی ہے۔ یہ کوئی انصاف ہے۔ بہن میری، دوست حیدر بھائی کی، میں آ
دوستی کرنا چاہتا تھا ایمن! یقین کریں میں بہت اچھا لڑکا ہوں۔ لڑکیاں مجھے بہت پسند کرتی ہیں۔ کچھ کو
ہینڈسم اور چارمنگ بھی لگتا ہوں۔ آپ میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہیں جو مجھ سے ذرا سا بھی م
ہوئیں۔" باوجود غصے کے وہ اپنی مسکراہٹ روک نہیں پائی تھی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر اس نے طمانیت بھر
لی تھی۔

"دوستی کرنے کے لیے یہ ایکٹنگ کرنی ضروری تھی؟" اس نے ناراضی سے اسے گھورا۔

"مجھے اور کوئی طریقہ ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ رات ہی یہ بات میرے ذہن میں آئی اور صبح ہی
بھی مل گیا۔ دراصل میں چیک کرنا چاہتا تھا کہ آپ جتنی لاتعلق نظر آتی ہیں حقیقت میں ایسی ہیں یا نہیں
جواب مل گیا کہ آپ ایسی نہیں ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بیڈ پر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔

"ہماری مائیں الگ ہیں مگر ہمارے پاپا تو ایک ہیں۔ ہم پاپا کو شیئر کرتے ہیں ایمن! پاپا سے جو رش
ہے وہی میرا بھی تو ہے۔ آپ مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہیں؟ آپ کی زندگی میں جو کچھ بھی ہوا اس م
کہیں بھی، کوئی قصور نہیں۔

میں آپ کی سب تکلیفوں کے لیے دکھ محسوس کرتا ہوں ایمن! پہلے پہل جب مما، پاپا کے امریکہ آ
نے آپ کا ذکر سنا تو میں بہت حیران ہوا تھا کہ اچانک میری بہن کہاں سے نکل آئی۔ مما، پاپا نے مجھے
کبھی نہیں بتائی تھی۔ شروع میں جب میں نے آپ کے بارے میں سنا تو مجھے یہ بات بہت بری لگی تھ
سے کوئی لڑکی اچانک نکل آئی میرے پاپا کو میرے ساتھ شیئر کرنے کے لیے۔ پھر جب حیدر بھائی یو
اور انہوں نے مجھ سے آپ کے بارے میں باتیں کیں تو مجھے پتا چلا کہ آپ کے ساتھ کتنی زیادتیاں ہ
بچپن میں پاپا کی جو محبت اور توجہ مجھے ملی اس پر آپ کا بھی حق تھا لیکن ایمن! اتنا تو آپ بھی مانیں گی ک
ساتھ جو کچھ بھی غلط ہوا اس کے لیے میں ہرگز قصوروار نہیں۔" وہ اس کے ہاتھوں کے اوپر اپنے ہاتھ رکھ
سے بولا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کی زندگی میں جو کچھ بھی ہوا اس میں سائر کا کوئی قصور نہ
اپنے نصیب کی محرومیوں کا شکوہ اس سے نہیں کر سکتی تھی۔

"آپ کو میری ایکٹنگ کیسی لگی؟ یہ بات تو آپ مانیں گی کہ میں بہت زبردست ایکٹر ہوں۔
اسکول میں ڈراموں میں حصہ لیتا تھا تو ہمیشہ بیسٹ ایکٹر کا ایوارڈ مجھے ہی ملتا تھا۔" وہ اس کی شرارت بھ
مسکراہٹ کو دیکھ کر مسکرائی۔

"تمہاری ایکٹنگ بہت اچھی تھی۔ خوب اچھی طرح تم نے مجھے الو بنایا ہے۔ مجھے ایک سیکنڈ کے لیے بھی یہ شک نہیں ہوا کہ تم ایکٹنگ کر رہے ہو۔" اسی وقت رشیدہ دروازہ ناک کرتے ہوئے ناشتے کی ٹرے اٹھائے اندر آئی تھی۔ "آپ کہاں جا رہی ہیں بیٹھیں نا۔" وہ اسے اٹھتا دیکھ کر بولا۔

"تم ناشتہ کرو، مجھے اپنے نوٹس بنانے ہیں۔"

"پتا ہے مجھے آپ بہت پڑھاکو ہیں۔ دس دن بعد میں چلا جاؤں گا تو خوب دل بھر کر پڑھائیاں کر لیجیے گا۔ یہ تھوڑے سے دن اگر آپ مجھے کمپنی دے دیں تو آپ کی پڑھائی کا اتنا زیادہ حرج بھی نہیں ہوگا۔" وہ شکوہ کرنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگا تو وہ دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"آج رات چلیں گی ناں آپ حیدر بھائی کے گھر پر۔ بی بی نے آج ہم لوگوں کو ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔ ویسے اس دعوت کا مہمان خصوصی میں ہوں۔" وہ آملیٹ کھاتے ہوئے اس سے بولا۔ وہ اس ڈنر کے بارے میں پہلے سے جانتی تھی۔ کل اس کے سامنے ہی الماس نے توفیق کمال کو بی بی کے فون کے بارے میں بتایا تھا۔ "بی بی نے کہا ہے کہ ایمن بھی ضرور آئے۔" الماس نے اسے بی بی کی اس سے متعلق کہی جانے والی بات بتائی تھی۔ اگر بی بی نے الگ سے اس کا نام نہ بھی لیا ہوتا تب بھی وہ ان کے گھر ضرور جاتی۔ وہاں کے مکینوں کے لیے اسے الگ سے بطور خاص کسی دعوت نامے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

* * *

"حیدر بھائی! آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ آہستہ آہستہ پاپا جیسے ہوتے جا رہے ہیں۔ اتنی دیر سے آپ مسلسل میری یونیورسٹی' پروفیسرز اور پڑھائی سے متعلق باتیں کیے جا رہے ہیں۔" ڈنر کے بعد بی بی' توفیق کمال اور الماس لاؤنج میں بیٹھ کر کافی پینے لگے تھے جب کہ یہ تینوں سائر کی فرمائش پر لان میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ وہ بہت ہنگامہ پرور اور ہلے گلے کا شوقین تھا۔ سنجیدہ گفتگو زیادہ دیر تک اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ حیدر اس کے شکوے پر کافی کا سپ لیتے ہوئے مسکرایا۔

"ایک تو مجھے آئے ہوئے اتنے دن ہو گئے اور آپ نے مجھے بالکل لفٹ نہیں کروائی۔ میں نے آتے ہی اگلے دن فون کیا تو پتا چلا کہ جناب کسی سیمینار یا کانفرنس میں شرکت کے لیے جرمنی گئے ہوئے ہیں اور آج جب اتنے دنوں بعد ہماری ملاقات ہو رہی ہے تو بالکل پاپا والی ٹون میں میری اسٹڈیز کا حال احوال دریافت کر رہے ہیں۔" وہ کافی پیتے ہوئے خاموشی سے سائر کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ سوچ کر ہنسی آ رہی تھی کہ اپنے باپ سے متعلق صرف وہی حیدر مسعود سے گلے شکوے نہیں کرتی۔ سائر بھی یقیناً اس سے اپنے دکھڑے رو لیتا ہے۔

"کل سنڈے ہے اور میں بالکل فارغ بھی ہوں۔ کل کا سارا دن میں تمہیں دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"پکنک پر چلتے ہیں حیدر بھائی! میں' آپ اور ایمن بس ہم تینوں۔"

"لگتا ہے بھائی' بہن میں بہت اچھی دوستی ہو گئی ہے؟" اس نے یہ بات ان لوگوں کے یہاں آتے ہی نوٹ کر لی تھی مگر بولا کچھ نہیں تھا۔ سائر اس کی بات سن کر ایمن پر ایک شرارت بھری نگاہ ڈال کر مسکرایا۔

"ایسے ہی دوستی نہیں ہو گئی۔ اس کے لیے مجھے کافی محنت کرنی پڑی ہے۔" وہ اس کے احتجاج کے باوجود

ہنس ہنس کر حیدر کو صبح کی ساری بات بتا رہا تھا۔

"ان کی شکل دیکھنے والی تھی حیدر بھائی!"

"سائر! اٹھو' میرے بھیا' میرے چندا۔"

"جی نہیں' میرے بھیا اور میرے چندا میں نے نہیں کہا تھا۔" وہ اس جھوٹ پر احتجاجاً چلائی تھی۔

"اب تھوڑا بہت تو اپنی طرف سے اضافہ کروں گا ناں۔" حیدر اور سائر اس واقعہ کا مزا لیتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس رہے تھے چند سیکنڈز بعد وہ بھی اس ہنسی میں شریک ہو گئی تھی۔

وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو سائر لاؤنج میں بالکل تیار بیٹھا نظر آیا۔ وہ لوگ کافی صبح گھر سے نکل رہے تھے۔ حیدر کے ساتھ ان لوگوں کا یہ پروگرام طے ہوا تھا کہ وہ لوگ ناشتہ بھی ساحل پر پہنچ کر کریں گے ٹھیک سات بجے حیدر کی گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ کسی ملازم کے آ کر اطلاع دینے سے پہلے ہی وہ دونوں باہر نکل آئے۔ لان میں توفیق کمال واک کرنے میں مصروف تھے۔ انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے وہ دونوں گیٹ سے باہر نکل آئے۔ حیدر گاڑی میں بیٹھا ان دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔

"آپ آگے بیٹھ جائیں۔ اب بڑی بہن کا کچھ تو احترام کرنا پڑے گا۔"

"ایک منٹ رکو۔" حیدر کے کہنے پر وہ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے رک گئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر اس کے پاس آیا اور گاڑی کی چابی اس کے ہاتھ میں پکڑا کر بولا۔

"تم ڈرائیو کرو' ذرا میں دیکھوں تو سہی تمہاری ڈرائیونگ کیسی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے چابی لے لی تھی۔ حیدر ہی کے کہنے پر اس نے تین چار مہینے پہلے ڈرائیونگ سیکھی تھی۔

"ہم کب پہنچیں گے حیدر بھائی؟ مجھے تو بڑی سخت بھوک لگ رہی ہے۔" وہ تھوڑی دیر بعد بھوک کا شور مچا رہا تھا۔

"دیکھو' تمہاری بہن صاحبہ آج ہی کی تاریخ میں ہمیں پہنچا دیں تو۔" وہ اس کی ضرورت سے زیادہ محتاط ڈرائیونگ پر چوٹ کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے کار ریسنگ میں حصہ لینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ فاسٹ ڈرائیونگ کرنی ہے تو آپ دونوں میں سے کوئی کیوں نہیں گاڑی چلا لیتا۔" اس نے گاڑی سڑک کے کنارے پر روک دی تھی۔

"دیکھا تم نے ایما کو ناراض کر دیا نا سائر۔"

"سائر نے نہیں آپ نے۔" اس نے تصحیح کی۔ "آپ دونوں کے جھگڑے میں گاڑی جس رفتار سے چل رہی تھی اس سے بھی گئی۔"

"بیٹھیے آپ ایمن! اسٹیئرنگ میرے حوالے کیجیے' نہ آپ لوگوں کو آدھے گھنٹے میں منزل پر پہنچایا تو میرا نام سائر توفیق نہیں۔" سائر کے جوشیلے انداز کو سننے کے بعد وہ ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر پیچھے بیٹھ گئی۔

"ہم کب پہنچیں گے۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔" کہہ کر سائر کو مزید جوش دلا رہی تھی۔

ناشتہ ان لوگوں نے بہت ہلکا پھلکا کیا تھا۔ چیز سینڈوچز' فروٹ کیک اور چائے۔ ان لوگوں کا باربی کیو کا ارادہ تھا اس لیے ناشتے کے لیے زیادہ اہتمام نہیں کیا تھا۔

ناشتے کے بعد سائر نے لباس تبدیل کر کے شارٹس اور ٹی شرٹ پہن لیے تھے۔ وہ باقاعدہ سوئمنگ کے موڈ میں تھا جب کہ حیدر نے صرف اپنی جینز کو تھوڑا سا موڑ لیا تھا۔ سائر سوئمنگ کرتا ہوا کافی آگے چلا گیا تھا وہ دونوں پانی میں اس حد تک آگے آئے تھے کہ بس ان کے پیر ٹخنوں تک پانی میں بھیگ رہے تھے۔

”تمہیں سائر کیسا لگا ایما؟“

”بہت اچھا' جیسا میرے ذہن میں تھا۔ وہ اس سے بہت مختلف ہے۔“ اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوری سچائی سے جواب دیا۔

”آپ اس سے میری خوب تعریفیں کر کے آئے تھے' ہے ناں؟“ وہ اس سوال پر ہنسا۔

”اب خدا کے لیے تم کوئی بے تکی مثال مت دینا۔ کسی سے تمہاری تعریف کروں تو تم ناراض ہو کر انتہائی بے تکی مثالیں دیتی ہو۔“ وہ جس بات کو یاد دلا رہا تھا اسے یاد کر کے وہ خود بھی ہنسنے لگی تھی۔ سائر سوئمنگ کرتا ہوا واپس ان لوگوں کے پاس آ گیا تھا۔ ”آپ دونوں پکنک پر آئے ہیں یا کوئی سنجیدہ قسم کے مذاکرات کرنے؟“

”ہم تمہاری برائیاں کر رہے تھے۔“ اس نے سائر کو چڑایا۔

”آپ دونوں سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے؟“ اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”آگے چلیں ناں پانی میں۔“ وہ ان دونوں سے بولا۔

”آپ دونوں جائیں' مجھے پانی سے ڈر لگتا ہے۔“ اس نے آگے جانے سے فوراً انکار کر دیا تھا۔

”ڈر؟ وہ دو ماہر تیراکوں کی موجودگی میں؟ بے فکر رہیں' ہم آپ کو ڈوبنے نہیں دیں گے۔“ سائر نے ایک دم ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پانی میں آگے لے جا رہا تھا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔

”سائر پلیز' مجھے واقعی ڈر لگتا ہے۔“ اس نے چلا کر کہا۔

”کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اچھا ہے اس طرح آج آپ کا یہ ڈر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔“ وہ بے فکرے انداز میں بولا۔ حیدر چلتا ہوا ان لوگوں تک پہنچ گیا۔

”ایسا لگ رہا ہے تم اسے اغوا کر کے لے جا رہے ہو۔“ اس کا دوسرا ہاتھ پکڑتے ہوئے وہ سائر سے بولا۔ اس کے ہاتھ پکڑتے ہی اس نے چیخنا بند کر دیا تھا۔ پانی سے ڈر ابھی بھی لگ رہا تھا مگر دل میں اچانک ہی یہ اطمینان ابھرا تھا کہ اب میں ڈوبوں گی نہیں' مجھے کوئی چوٹ نہیں لگے گی۔ سائر اس کی اغوا والی بات پر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

”واپس چلو ورنہ یہ محترمہ چیخنے کے ساتھ ساتھ یہیں کھڑے ہو کر رونا بھی شروع کر دیں گی۔“ حیدر نے جیسے اسے ڈرایا تھا۔

”آپ واقعی اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر روتی ہیں؟“ اس نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”میں کوئی نہیں رو رہی ہوں۔ ہاں سمندر میں آگے جاتے ہوئے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔“ وہ چڑ کر بولی
لوگ واپس مڑ گئے تھے۔ جہاں پر پانی بہت گہرا نہیں تھا اور بس چھوٹی موٹی سی لہریں آ کر اس کے ٹخنوں کو چھ
تھیں' وہاں آ کر حیدر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

اس کا دل چاہا وہ اسے بتائے کہ اس کے ہاتھ پکڑنے پر اسے کس طرح کے تحفظ کا احساس ہوا تھا۔ اس
یہ بھی چاہا تھا کہ کاش وہ یہ ہاتھ کبھی نہ چھوڑتا' اسی طرح پکڑے رہتا' ہمیشہ' ساری زندگی' اپنی اس سوچ پر اس
گھبرا کر سر کو مزید جھکا لیا تھا۔ سائر نے ابھی بھی اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ وہ پانی سے باہر خشکی پر آ گئے تھے ت
سائر نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔

”لگتا ہے میں نے واقعی آپ کو بہت ڈرا دیا ہے۔ سوری ایمن! مجھے اندازہ نہیں تھا آپ پانی سے اتنا
ہیں۔“ وہ اس کی خاموشی کو اس کا خوف اور ناراضی سمجھ کر شرمندگی سے بولا۔ وہ اس کی شرمندگی دور کر
لیے مسکرائی۔

”کوئی بات نہیں۔ ڈرنے کے ساتھ ساتھ میں نے اس ایڈونچر کو انجوائے بھی کیا ہے۔“ اس کی بات
اس کے چہرے پر سے شرمندگی کے آثار فوراً مٹا دیے تھے۔ باربی کیو کے لیے قیمے اور گوشت پر مسالے لگ
لوگ گھر سے لائے تھے۔ اب صرف تیاری کے آخری مراحل طے کرتے ہوئے تکے اور کباب بھو
کھانے کا کام کیا جا رہا تھا۔ وہ لوگ چٹائی بچھا کر ذرا چھاؤں والی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سائر صرف شو
تھا جب کہ حیدر اور ایمن دوسرے کونے پر بیٹھ کر کباب تیار کرنے اور انہیں گرل پر سے اتار اتار کر پلیٹ
ڈالنے میں مصروف تھے۔

وہ اس کے لیے اسپرائٹ کا کین کھول رہی تھی جب ان کے بالکل قریب ایک خوب صورت نسوانی
ابھری۔

”ہیلو۔“ ان دونوں نے ایک ساتھ سر اٹھا کر آنے والی شخصیت کی طرف دیکھا تھا۔

”ہیلو۔“ حیدر نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا کباب منہ میں لے جاتے ہوئے جواباً ہیلو کہہ دیا تھا۔ ا
چونک کر حیدر کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے میں کوئی مختلف بات تھی جسے وہ فوری طور پر کوئی نام نہیں د
تھی۔

”کیسے ہو حیدر؟“ وہ کوئی دیرینہ شناسا تھی کیونکہ اس کا لہجہ حد درجہ بے تکلفی اور قربت کا اظہار کر رہا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اسپرائٹ کا کین ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ اس نے اخلاقاً بھی ان
کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”سائر توفیق بھی یہاں موجود ہیں۔ گویا کہ بڑے اہتمام سے پکنک منائی جا رہی ہے۔“ ایمن نے
موڑ کر سائر کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی پلیٹ اور کین چٹائی پر رکھ کر کچھ کنفیوز سا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پ

تاثرات تھے جیسے وہ یہ فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ اسے ان خاتون سے کس طرح بات کرنی چاہیے۔

"السلام علیکم۔" بالآخر اس نے کچھ سوچتے ہوئے انہیں سلام کر لیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ بالکل اپنے پاپا جیسے لگنے لگے ہو سائر! ان ہی کی طرح ہینڈسم۔" وہ بے تکلفانہ انداز میں مسکرائی تھی۔ سائر جواباً مسکرایا نہیں تھا۔ وہ الجھے ہوئے انداز میں حیدر کو دیکھنے لگا تھا۔ ایسے جیسے اس کے چہرے پر موجود تاثرات کو دیکھ کر وہ یہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ اسے ان محترمہ سے بات کرنی چاہیے یا نہیں۔

"بجیلہ بابر؟" سائر کی کنفیوژن اور پریشانی نے اسے یہ بات سمجھنے میں مدد دی تھی۔ اس نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی خوب صورت تھی۔ اس کے شہد رنگ کے سلکی اور گھنے بال کمر تک آ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کا رنگ نیلا تھا' اس کے چہرے کی رنگت بے تحاشا سفید تھی۔ اس کی تھوڑی پر موجود ڈمپل نے اس کی خوب صورتی میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ اس نے میک اپ شاید بالکل بھی نہیں کیا تھا۔ اسے میک اپ کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔

"میں اپنی فرینڈز کے ساتھ پکنک پر آئی ہوں۔ اتفاق سے ابھی میری تم پر نظر پڑ گئی اور میں یہاں آ گئی۔" وہ حیدر سے کہتے ہوئے بے تکلفی سے چٹائی پر بیٹھ گئی۔ اسے جیسے یہ بات نظر نہیں آ رہی تھی کہ اس کی آمد کو یہاں کچھ خاص پسند نہیں کیا گیا۔

"تم لوگ یہاں باربی کیو کر رہے ہو۔ یہ ہے پکنک کا صحیح مزا اور میری فرینڈز اتنی بور چیزیں اٹھا لائی ہیں۔ کچھ پکائیں اور پھر کھائیں اس میں ہی پکنک کی اصل خوب صورتی ہے۔" وہ مخاطب حیدر اور سائر سے تھی لیکن دیکھ ایمن کو رہی تھی۔ اسے بجیلہ بابر کی نگاہوں سے بہت خوف آ رہا تھا۔ حیدر' بجیلہ کی طرف دیکھنے یا اسے توجہ دینے کے بجائے اسپرائٹ پینے میں مصروف تھا۔

"آپ کی تعریف؟"

"میں ام ایمن ہوں۔" ایک نظر حیدر پر ڈالنے کے بعد یہ دیکھ کر وہ بجیلہ سے اس کا تعارف کروانے کے موڈ میں نہیں' اس نے اپنا نام بتا دیا تھا۔ وہ جواباً بڑی بے ساختگی سے ہنسی تھی۔

"آپ ام ایمن ہیں۔ افسوس میں اخبار زیادہ پابندی سے پڑھ نہیں پاتی' اس لیے آپ سے واقف نہیں ہوں۔" اس کا مزاحیہ سا لہجہ بظاہر دوستانہ تھا مگر اس میں چھپی طنزیہ کاٹ وہ بہت اچھی طرح محسوس کر سکتی تھی۔ وہ جواب میں کوئی ٹھیک ٹھاک کرارا سا جملہ اس کی طرف اچھال سکتی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ بجیلہ بابر تھی اور ایمن نہیں جانتی تھی کہ اسے اس عورت سے کس انداز میں بات کرنی چاہیے۔ کہیں اس کے بدتمیزی سے جواب دینے پر حیدر برا نہ مان جائے۔ حیدر نے ایک دم ہی ہاتھ میں پکڑا کین زمین پر رکھ دیا تھا۔

"یہ میری دوست ہے۔ بس اتنا تعارف کافی ہے یا مزید کچھ اور بھی جاننا ہے؟" اس کے لہجے میں اب ناپسندیدگی واضح طور پر ظاہر ہوئی تھی۔ ایمن کے تعارف میں اس نے توفیق کمال اور سائر کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ شاید وہ گفتگو کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔

"تم تو برا مان گئے حیدر! میں یونہی مذاق کر رہی تھی۔" وہ کھلکھلائی تھی۔

"تم لوگ اخلاقاً بھی مجھے کھانے میں شریک نہیں کر رہے تو میرا خیال ہے اب مجھے اٹھ جانا چاہیے۔" و
پر سے نظریں ہٹا کر حیدر سے بولی۔ سائر ان لوگوں سے فاصلے پر بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ بجیلہ مسکراتے ہو
اس کے پاس گئی۔

"ہائے ہینڈسم لڑکے! پھر ملیں گے۔ ابھی تو میں کراچی ہی میں ہوں۔ فی الحال لندن واپس جانے کا میر
ارادہ نہیں ہے۔" اس نے جتانے والے انداز میں کہا۔ سائر ہونق انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سائر
ہاتھ ملا کر وہ اس کے پاس آ گئی۔

"خدا حافظ مس ام ایمن!" ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کرتے ہوئے اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"خدا حافظ مس بجیلہ بابر!" وہ اس کے منہ سے اپنا نام سن کر ہنسی۔

"لگتا ہے حیدر نے میرا خوب اچھی طرح تعارف کروا رکھا ہے۔" اس نے مسکرا کر حیدر کی طرف دیکھا۔

"اچھا حیدر' میں چلتی ہوں۔" اس نے سر اٹھائے بغیر کباب کھاتے ہوئے گردن ہلا کر اس کی بات کا جوا
دے دیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد دو تین منٹ ان لوگوں کے درمیان بالکل خاموشی رہی تھی۔

"کیچپ دینا سائر!" حیدر نے اپنی پلیٹ سے ایک سیکنڈ کے لیے توجہ ہٹا کر سائر کو دیکھا۔ "ارے تم دونو
کیا ہوا بھئی؟" وہ ان دونوں کی خاموشی پر حیران ہوا تھا۔

"کھاؤ بھئی' ورنہ سب ٹھنڈا ہو جائے گا۔ تمہیں کیا ہوا ہے ایما! تھوڑی دیر پہلے تو بھوک بھوک چلا ر
تھیں۔" اسے جیسے کچھ دیر پہلے ہونے والے سین سے کوئی فرق پڑا ہی نہیں تھا۔ سائر اپنی جگہ سے اٹھ کر ا
دونوں کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"حیدر بھائی! بجیلہ آپی۔" وہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچایا۔

"میں نے تو سنا تھا انہوں نے دوسری شادی۔" وہ پھر جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا تھا۔

"ٹھیک سنا تھا تم نے۔" وہ اپنی پلیٹ میں کیچپ ڈالتے ہوئے مسکرایا۔

"پھر اب یہ؟ اور انہیں ہو کیا گیا ہے' یہ اس طرح سے تو بات نہیں کرتی تھیں۔"

"چھوڑو یار اس فضول ٹاپک کو۔ میں اس وقت نہ خود بور ہونے کے موڈ میں ہوں اور نہ تم دونوں کو بور کر
چاہتا ہوں۔ بجیلہ کی کوئی بات اگر تم دونوں میں سے کسی کو بری لگی ہے تو اس کے لیے میں سوری کہہ رہا ہوں۔"
بات کہتے وقت اس نے سائر سے زیادہ ایمن کی طرف دیکھا تھا۔ وہ لوگ دوبارہ سے کھانے پینے میں مصروف
ہو گئے تھے مگر وہ اب کوشش کے باوجود بھی اس پکنک کو انجوائے نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ بجیلہ کے بارے میں بات کیوں نہیں کرتا؟ بجیلہ سے اس کی شادی کس کی پسند سے ہوئی تھی' یقیناً اسی ک
پسند سے ہوئی ہوگی۔ پسند کر کے یا محبت کر کے؟ وہ ان دونوں باتوں میں بہت فرق سمجھتی تھی اور محبت کا صرف لف
سوچ کر ہی اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ کتنا اہم تھا یہ سوال اس کے لیے کہ حیدر مسعود نے زندگی میں کبھی بجیلہ بابر سے
محبت کی تھی یا نہیں۔

وہ لوگ چار بجے تک وہاں پر رہے اور واپسی میں وہ بہت الجھی ہوئی تھی۔

* * *

رات کو سائر اس کے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ''اگر آپ میرے آنے سے ڈسٹرب بھی ہوئی ہیں تب بھی میں جاؤں گا نہیں۔ اس لیے کہ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ مما اپنے بیڈروم میں جا چکی ہیں لہٰذا اب میں آپ کا سر کھاؤں گا۔'' وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھی لیکن نیند اسے خود بھی بالکل نہیں آ رہی تھی اس لیے وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے بیڈ پر ہی چڑھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''آج کی پکنک اچھی رہی نا ایمن؟'' وہ اپنی گود میں تکیہ رکھ کر بے تکلفی سے بیٹھا تھا۔ ''آپ نے بجیلہ آپی کو کیسے پہچانا تھا؟ اچھا' سمجھ گیا ضرور آپ نے ان کی کوئی تصویر دیکھی ہوگی۔'' اپنے سوال کا اس نے خود ہی جواب تلاش کر لیا تھا۔

''ان دونوں کی شادی کیسے ہوئی تھی سائر! میرا مطلب ہے حیدر اور بجیلہ کی۔'' یہ سوال اس طرح کرنا چاہتی تھی کہ اس میں صرف تجسس اور حیرت کا اظہار ہوتا ہو۔ وہ اس کے سوال پر مسکرایا۔

''آپ آج ان سے پہلی مرتبہ ملی ہیں اس لیے اس بات پر حیران ہو رہی ہیں کہ حیدر بھائی اور بجیلہ آپی ایک دوسرے سے اتنے مختلف نظر آتے ہیں پھر ان کی شادی کیسے ہوگئی۔ آج پکنک پر مجھے بھی وہ دونوں نارتھ پول اور ساؤتھ پول جتنے دور لگ رہے تھے۔'' اس نے اس بات پر سکون کا سانس لیا کہ سائر نے اس کی اس معاملے میں دلچسپی کو کسی اور انداز میں نہیں لیا تھا۔

''بجیلہ آپی پہلے ایسی نہیں تھیں ایمن! آج ان کے باتیں کرنے کے اسٹائل پر مجھے سخت حیرت ہوئی ہے۔ بہت اچھی' بڑی فرینڈلی سی تھیں وہ بجیلہ آپی لندن ہی میں پیدا ہوئی تھیں۔ انہوں نے وہیں سے آرکیٹیکچر کی تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ بہت اچھی آرکیٹیکٹ ہیں۔ میں تو اس وقت بہت چھوٹا تھا مگر مجھے تھوڑا بہت یاد ہے جب وہ اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آتی تھیں۔ حیدر بھائی کے گھر پر وہ لوگ ٹھہرتے تھے' مما بھی ان لوگوں کو ڈنر وغیرہ پر ضرور انوائٹ کرتی تھیں۔ حیدر بھائی کی بجیلہ آپی سے بہت دوستی تھی۔ مجھے یاد ہے اکثر گیمز میں وہ دونوں پارٹنر بنتے تھے۔ ان دونوں کی ایک دوسرے میں دلچسپی صاف ظاہر ہوتی تھی۔ ان دونوں کی منگنی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ ظاہر ہے اس شادی میں دونوں کے گھر والوں کے ساتھ ساتھ خود ان دونوں کی پسند بھی شامل تھی۔ حیدر بھائی کی شادی مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔ وہ اپنی شادی پر بہت خوش تھے۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ سب کچھ ٹھیک رہا تھا مگر پھر پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ مجھ سے حیدر بھائی نے کبھی یہ ساری باتیں ڈسکس نہیں کیں۔ پھر بھی جتن میں نے اندازہ لگایا وہ یہ تھا کہ بجیلہ آپی کو حیدر بھائی شادی کے بعد بہت قدامت پسند لگنے لگے تھے۔ وہ ان کے پروفیشن کے راستے میں حائل نہیں ہونا چاہتے تھے مگر وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ بجیلہ آپی اپنی زندگی میں پہلی اہمی اپنے گھر کو دیں۔ ان کے پروفیشن کا نمبر اس کے بعد آئے۔ بجیلہ آپی ان کے ان خیالات کو ناپسند کرتی تھیں کراچی سے زیادہ ان کا وقت لندن میں گزرتا تھا۔ میرا خیال ہے ان دونوں کے بیچ اختلافات کی بنیادی وجہ تھی۔ ایک سال کے اندر اندر ان دونوں کے تعلقات اس حد تک خراب ہو چکے تھے کہ بجیلہ آپی حیدر بھائی

شادی کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت قرار دینے لگی تھیں۔ وہ حیدر بھائی کی خواہش کے مطابق گھر کو اہمی
دینے پر تو کیا ان کے ساتھ اپنا رشتہ قائم رکھنے کے لیے بھی تیار نہیں تھیں۔
انہیں آرکیٹیکچر میں مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکالرشپ ملی تو انہوں نے آسٹریلیا جانے کا فیصلہ کرنے ک
ساتھ ہی حیدر بھائی سے طلاق کا مطالبہ بھی کر دیا۔ بی بی اس بات پر بہت اپ سیٹ ہوئی تھیں۔ ان کے لیے
بہت بڑا صدمہ تھا۔ خود حیدر بھائی بھی اتنی جلد بازی میں اتنا بڑا فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بجیلہ آپ
کافی سمجھایا تھا۔ ان سے یہ کہا تھا کہ وہ پڑھنے کے لیے آسٹریلیا چلی جائیں مگر طلاق والی بات کو اتنی جلد باز
میں نہ سوچیں۔ وہ دونوں کچھ عرصہ ایک دوسرے سے دور رہیں گے تو شاید ان کے بیچ موجود اختلافات کچھ کم
جائیں' شاید سمجھوتے کی کوئی صورت نکل آئے' مگر بجیلہ آپی سمجھوتہ کرنا چاہتی ہی نہیں تھیں۔ انہیں اپنا کیریئر ب
تھا' بس پھر ایک سال بعد ہی ان کی علیحدگی ہو گئی تھی۔ بجیلہ آپی نے طلاق کے تھوڑے عرصہ بعد ہی شادی کر
تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ آسٹریلیا میں ہی رہ رہی تھیں۔ اس کے بعد کیا ہوا' مجھے نہیں معلوم۔ آج انہیں ا
سالوں بعد دیکھا ہے تو میں ان کے انداز پر حیران ہوا ہوں۔ مجھے ان کے اسٹائل سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ حی
بھائی سے دوبارہ تعلق جوڑنا چاہتی ہیں۔ لگتا ہے ان کے اپنے شوہر سے تعلقات ٹھیک نہیں رہے ہیں۔ کیا
طلاق ہو چکی ہو۔ پوچھوں گا میں مما سے کل یہ بات۔'' وہ اسے ساری بات بتا کر خاموش ہوا تو وہ اس معاملے
خود کو لاتعلق ظاہر نہیں کر پائی۔

''بجیلہ کی اپنے شوہر سے طلاق ہو چکی ہے۔'' اس کے باخبر ہونے پر حیران نہیں ہوا تھا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا
کہ اسے یہ بات حیدر نے بتائی ہوگی۔

''میں حیدر بھائی جیسا بننا چاہتا ہوں ایمن! ویسے تو پاپا بھی بہت اچھے ہیں مگر ان کی بعض باتیں مجھے اچھ
نہیں لگتیں اور حیدر بھائی' وہ ایسے ہیں کہ ان جیسا بننے کی خواہش کی جائے۔'' وہ بچپن سے حیدر کو دیکھ رہا تھا'
اس کی بے شمار خوبیوں سے متاثر تھا۔

''تم ہر کسی کو اپنا اسیر بنا لیتے ہو۔ تم ہر کسی کو خود سے متاثر ہو جانے پر مجبور کر دیتے ہو' تب ہی تو وہ عورت
اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے تمہیں چھوڑ گئی تھی واپس تمہارے پاس آنا چاہتی ہے کوئی بات ایسی ہے تم میں جو تمہیں
سب سے الگ بناتی ہے۔'' سائر کے جانے کے بعد وہ بیڈ پر لیٹتے ہوئے حیدر مسعود کے بارے میں سوچ ر
تھی۔ حیدر نے اس سے تمام تر بے تکلفی' دوستی اور اپنائیت کے باوجود اپنے اور اس کے درمیان ایک لکیر کھینچ
رکھی ہوئی ہے۔ آج بجیلہ سے ملنے کے بعد وہ یہ بات زیادہ سنجیدگی سے سوچنے لگی تھی۔ اسے پتا تھا وہ حیدر سے
بجیلہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کر پائے گی۔ اس نے اسے بہت سے حق دینے کے باوجود بھی اپنی ذا
زندگی کی بہت سی باتوں کے بارے میں کوئی حق نہیں دیا تھا۔

* * *

سائر کا آنا اس کے لیے جتنا غیر اہم تھا' اس کا جانا اتنا ہی اہم' وہ اس کے جانے پر اداس تھی۔ اس کے ہو
سے زندگی میں کتنا خوشگوار سا احساس ہونے لگا تھا۔ ایک خوب صورت سے رشتے کا احساس' ان درمیان ک

آٹھ نو دنوں میں اس نے سائر کو بھرپور کمپنی دی تھی۔ وہ دونوں بہت سی جگہوں پر گھومنے گئے تھے۔ کئی مرتبہ انہوں نے لنچ اور ڈنر گھر سے باہر ایک ساتھ کیا تھا۔ وہ بوسٹن میں موجود اپنے دوستوں کے لیے کچھ تحائف خریدنا چاہتا تھا' وہ اس کے ساتھ بازار بھی گئی تھی تاکہ شاپنگ میں اس کی مدد کر سکے۔ توفیق کمال اور الماس اسے ایئرپورٹ پر چھوڑنے جا رہے تھے۔ ایمن نے اسے گھر پر ہی خدا حافظ کہہ دیا تھا۔

"میں آپ کو فون کروں گا تو مجھ سے بات کریں گی؟" توفیق کمال اور الماس پورچ میں جا چکے تھے اور وہ لاؤنج میں کھڑا اس سے وعدے لے رہا تھا۔

"ہاں۔" وہ جواباً مسکرائی تھی۔ "میری ای میلز کا جواب دیں گی؟" "ہاں۔"

"میرے ساتھ چیٹنگ کیا کریں گی؟ روزانہ نہیں کبھی کبھار؟" وہ اس کے معصومانہ انداز پر ہنسی تھی۔

"نہیں۔" وہ اس کے انکار پر حیران ہوا اسے اس جواب کی امید نہیں تھی۔ "کبھی کبھار نہیں' ہم روزانہ چیٹنگ کیا کریں گے۔" اس کے جواب نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ سائر کے لیے ام ایمن ایک عام سی لڑکی تھی جس سے نہ اسے محبت تھی نہ نفرت' اس عام لڑکی کو اس کے لیے خاص بنانے والا حیدر مسعود تھا۔ اس نے سائر کو اس بات کا احساس دلایا تھا کہ ایمن اس کی بہن ہے اور اپنی بہن سے اسے محبت کرنی چاہیے۔ اس نے سائر کو ایمن کے بارے میں وہ سب کچھ بتایا تھا جس کی بنیاد پر وہ اس سے ملنے سے پہلے ہی اسے پسند کرنے لگا تھا۔

* * *

پورچ سے نکل کر مرکزی دروازے تک جاتے ہوئے اس کی نظر لان میں بیٹھے ہوئے توفیق کمال اور حیدر پر پڑی تو وہ اندر جانے کے بجائے اس طرف آ گئی۔ وہ دونوں کل رات ہی کولمبو سے واپس آئے تھے۔ حیدر اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے ان دونوں کو مشترکہ سلام کیا۔ سلام کا جواب ملتے ہی اس کا وہاں سے چلے جانے کا ارادہ تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹھو۔" سلام کا جواب تو ان دونوں نے دیا تھا مگر بیٹھنے کے لیے اسے توفیق کمال نے کہا تھا۔ وہ ان کے بیٹھنے کے لیے کہنے پر بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ وہ حیرت زدہ اور کچھ نروس سی ان دونوں کے قریب رکھی تیسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تمہارے ایگزامز میں کتنے دن رہ گئے ہیں؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تین مہینے۔" دل ہی دل میں حیران ہوتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔

"ایگزامز کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ حیدر بتا رہا تھا تم ایم بی اے کرنا چاہتی ہو۔"

"جی۔" وہ مختصر سا "جی" کہہ کر خاموش ہو گئی تھی۔

"حیدر نے اور میں نے یہ طے کیا ہے کہ تم یونیورسٹی کے بعد روزانہ تین چار گھنٹوں کے لیے آفس آنا شروع کر دو۔ جب تمہارا انٹرسٹ اسی طرف ہے اور آگے تم نے بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھنے کا ارادہ بھی کیا ہوا ہے تو بہتر ہے تم ابھی سے ہی بزنس کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنا بھی شروع کر دو۔ ایگزامز کے بعد تم باقاعدہ آفس جوائن

کر لینا۔ ایم بی اے تو تم ایوننگ میں کرو گی۔" وہ اس پر نظریں جمائے بہت سنجیدگی سے حکمیہ انداز میں اس سے مخاطب تھے۔

"تمہیں گھر بیٹھے جاب آفر ہو رہی ہے ناشکری لڑکی' منہ پھاڑ کر اس طرح بیٹھی ہو جیسے پتا نہیں تم سے کیا کہ دیا گیا ہے۔" حیدر کی آواز نے اسے اس بے یقینی والی کیفیت سے باہر نکالا تھا۔ کیا وہ واقعی اپنے باپ کو متا کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی یا یہ صرف حیدر کے کہنے پر کیا جا رہا تھا۔ اس کی بے یقینی اور حیرت پر توفیق کمال مبہ سا مسکرائے تھے جب کہ حیدر باقاعدہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا تھا۔

وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ کس بات پر اس قدر حیران ہو رہی ہے۔

"بس اب تم جاؤ اور جاتے ہوئے دین محمد سے دو کپ کافی لان میں بھجوانے کا کہتی ہوئی جانا۔" اس پر سے نظریں ہٹا کر وہ دوبارہ حیدر کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ حیرت زدہ سی دین محمد سے کافی کا کہتی ہوئی اپ کمرے میں آ گئی تھی۔

"مجھے پتا ہے' آپ ہی نے کی ہو گی پاپا سے میری سفارش۔" اس نے اسی رات حیدر کو فون کیا تھا۔

"محترمہ اب آپ میری سفارشوں اور تعریفوں کے دور سے نکل چکی ہیں۔ اب تو جو تمہارے رشتے کے ل آئیں گے ان سے بھی تمہاری تعریفیں کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تمہاری سب خوبیاں بغیر بتائے ہی ایک کو نظر آتی ہیں۔" وہ جواباً ہنستے ہوئے بولا۔

"توفیق بھائی تین چار روز پہلے میرے ساتھ تمہارے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے ایمن ماسٹرز کر لے تو میں اسے بزنس کی طرف لے کر آؤں گا۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ کا یہی ارادہ ہے اسے ابھی سے ہی آفس بلانا شروع کر دیجیے اور کچھ نہ سہی کم از کم ان تین چار مہینوں میں وہ آفس کے ماحول عادی ہو جائے گی۔ خود کوئی کام چاہے نہ کرے مگر کام ہوتا ہوا تو دیکھے گی۔" وہ سنجیدگی سے اسے ساری با بتانے لگا۔

"یقین کر لو اس بات کا ایما! کہ تم توفیق بھائی کو اپنی ذہانت سے کافی زیادہ متاثر کر چکی ہو۔ انہیں تم سے او سائر سے بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ہماری کمپنی کو اور آگے لے کر جائیں۔

اس پرسکون اور آرام دہ کمرے کے مکمل خاموشی میں ڈوبے ماحول میں بیٹھ کر اسے نیند آنے لگی تھی۔ درواز کھلنے کی آواز پر اس نے چونک کر جلدی سے سر اٹھایا۔

"رات میں پڑھنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ میں یونہی ٹی وی پر ایک موو ی دیکھنے لگی حالانکہ مووی کچھ خاص بھ نہیں تھی مگر پھر بھی میں نے پوری دیکھی۔ دراصل اس کا ہیرو بہت ہینڈسم تھا' بالکل آپ کی طرح۔" اس نے ہنست ہوئے بہت مزے سے اسے بتایا۔

"کیا کہہ رہی ہو پھر سے کہو' میں نے کچھ ٹھیک سے سنا نہیں۔" ٹیبل پر ذرا آگے کی طرف جھکتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"ایسی باتیں بار بار نہیں کہی جاتیں۔" اس کے شانِ بے نیازی سے جواب دینے پر وہ کھل کر ہنس دیا۔

''اب میری اتنی اچھی تعریف کر کے تم نے میرا دل خوش کیا ہے تو مجھے تمہارے لیے کچھ اچھے سے لنچ کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔'' وہ انٹرکام پر پیون کو اس کے لنچ سے متعلق ہدایات دینے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

''یونیورسٹی میں چاٹ کھالی تھی' لنچ کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔'' اسے پتا تھا وہ اس کے ساتھ تکلف نہیں برتتی تھی۔ اسی وجہ سے اس نے مزید اصرار نہیں کیا تھا۔

''پھر اب کام کی باتوں کی طرف آجائیں؟'' اس کے پوچھنے پر اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

''سب سے پہلے میں تمہیں کچھ باتیں سمجھانا چاہتا ہوں۔'' وہ اب مکمل طور پر سنجیدہ تھا۔

''تمہیں یہاں پر اس طرح سے رہنا ہے کہ تم توفیق کمال کی بیٹی لگو۔''

تم سب سے دوستانہ انداز میں بات کرو مگر اس دوستانہ انداز میں ایک نامحسوس سا فاصلہ موجود رہنا چاہیے۔ تم یہاں پر آرڈر لینے نہیں' آرڈر دینے آئی ہو۔ تمہیں کسی سے متاثر نہیں ہونا' تمہیں لوگوں کو خود سے متاثر ہونے پر مجبور کرنا ہے۔'' وہ پوری توجہ سے اسے سن رہی تھی۔

''تمہیں کمپنی کے کسی ایک ڈپارٹمنٹ کے بارے میں نہیں بلکہ تمام ڈپارٹمنٹس کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں۔ فی الحال میں مارکیٹنگ منیجر اور فنانس منیجر سے تمہیں ملوا رہا ہوں۔ تم ہفتے میں تین دن مارکیٹنگ اور تین دن فنانس منیجر کے ساتھ ہوگی۔ انہیں کام کرتا ہوا دیکھو گی' یہ سب کچھ تمہیں بہت مشکل لگے گا۔ بہت سی باتیں تمہاری سمجھ میں بھی نہیں آئیں گی۔ اپنے نوٹس بناتی جاؤ' ہر روز جو کچھ تمہیں سمجھایا اور بتایا جائے اسے اپنے پاس اپنے الفاظ میں نوٹ کرتی رہا کرو۔ یہ نوٹس آگے تمہارے بہت کام آئیں گے۔'' وہ اس کے منہ سے ساری تفصیلات سن کر تھوڑی مایوس ہوئی تھی۔

''میں تو سمجھ رہی تھی مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہوگا۔ آپ پتا نہیں مجھے کہاں بھیج رہے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ آپ مجھے کچھ نہیں سکھا رہے۔'' وہ اس کے بچوں جیسے انداز میں کیے جانے والے شکوے پر مسکرایا تھا۔ ''میں ہر وقت تمہاری مدد کے لیے موجود ہوں ایما! تمہارا جب دل چاہے' بے دھڑک میرے پاس آسکتی ہو لیکن تمہیں تمام بنیادی اور ابتدائی باتیں سیکھنی ہیں اور میرے پاس ظاہر ہے وہ تم کیسے سیکھ سکتی ہو۔''

''آپ نے پاپا سے بھی میری تعریفیں کر کر کے پتا نہیں انہیں میرے بارے میں کتنی غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ یونیورسٹی میں پروفیسرز کو متاثر کرنا اور پوزیشنز لینا الگ چیز ہے اور بزنس کے معاملات کو صحیح طرح سمجھنا الگ چیز ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمام آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹس کامیاب ایگزیکٹو بھی ہوتے۔'' وہ کل سے دل میں آنے والی اس سوچ کو اس کے سامنے ظاہر کیے بغیر رہ نہیں پائی تھی۔

''تمہیں میں نے منع کیا ہے نا ایسی باتیں کرنے کے لیے۔ تم سے بس جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔ باقی یہ فضول باتیں سوچنے کے لیے اپنے چھوٹے سے دماغ پر زیادہ زور مت دو اور تمہارا کیا خیال ہے توفیق بھائی کوئی ننھے سے بچے ہیں جن سے میں کسی کے بھی بارے میں جو کچھ کہوں گا وہ اسے مان لیں گے۔ وہ بزنس میں میرے

استاد ہیں۔ انہوں نے مجھے کام کرنا سکھایا ہے۔'' اسے ڈپٹتا ہوا وہ انٹرکام پر مارکیٹنگ منیجر اور فنانس
آنے کے لیے کال کرنے لگا۔

* * *

اسے آفس آتے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ اس کے آفس جانے کے ساتویں دن توفیق کمال
رات کے کھانے کے دوران اس سے آفس کے بارے میں تھوڑی بہت گفتگو کی تھی۔

اس روز آفس آنے پر وہ فنانس ڈپارٹمنٹ جانے سے پہلے حیدر سے ملنے اس کے آفس کی طرف
حیدر کی اس پر نظر پڑی تو وہ خوشگوار سے انداز میں مسکراتا ہوا فوراً رک گیا۔ اسے رکتا دیکھ کر وہ غیر ملکی لڑکی
گئی جو حیدر کے ساتھ تھی۔

''السلام علیکم۔'' اس کے قریب پہنچ کر اس نے اسے سلام کیا۔ اسے سلام کا جواب دینے کے بع
ساتھ کھڑی لڑکی کا تعارف کروانے لگا۔

''یہ فاطمہ مصطفیٰ ہیں۔ ہمارے نیویارک آفس میں ہماری کمپنی کی جنرل منیجر۔ یوں سمجھو کہ وہاں
تقریباً انہوں نے ہی سنبھالا ہوا ہے۔'' وہ اس سنہری بالوں والی غیر ملکی لڑکی کا مسلمانوں والا نام
حیران ہوئی۔ حیدر اب ایمن کے بارے میں بتانے لگا۔

''اس کا ایک تعارف تو یہ ہے کہ یہ توفیق بھائی کی بیٹی ام ایمن ہے اور دوسرا تعارف یہ ہے کہ یہ
پیاری دوست ہے۔'' ان دونوں نے آپس میں ہاتھ ملاتے ہوئے رسمی قسم کے جملوں کا تبادلہ کیا۔

''تم یقیناً میرے ہی پاس آرہی تھیں؟'' حیدر کے استفسار پر اس نے سر ہلا دیا۔

''آجاؤ پھر' میرا اور فاطمہ کا کافی پینے کا موڈ ہے' تم بھی ہمیں جوائن کرلو۔'' وہ ان دونوں کے سا
روم میں آگئی تھی۔ اندر آنے تک حیدر' فاطمہ کو اس کے متعلق مزید معلومات فراہم کرنے لگا۔

''حیدر! تمہاری فرینڈ بہت پرکشش ہے۔'' گو یہ تعریفی جملہ انگریزی میں ادا کیا گیا تھا مگر لہجے
آپ اور تم کا فرق ضرور واضح کر دیتی ہے۔ وہ اس بے تکلفانہ انداز پر چونکی تھی۔ حیدر کی جاننے والی
میں یہ اس نے پہلی لڑکی دیکھی تھی جو اگر اس سے بے تکلفی سے بات کر رہی تھی تو جواباً وہ بھی اس سے د
میں ہی مخاطب تھا۔

''آپ امریکن ہیں؟'' اس نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''ممی کی طرف سے تو مکمل طور پر امریکن ہوں مگر ڈیڈی کی طرف سے مکمل امریکن نہیں کہلا سک
ڈیڈی پیدا تو امریکہ ہی میں ہوئے تھے مگر ان کے پیرنٹس کا تعلق انڈیا سے ہے۔ اردو جو تھوڑی بہت
وہ بھی اس کمپنی کو جوائن کرنے کے بعد ہی ہوا ہے۔ سات سال ہو گئے ہیں مجھے یہاں جاب کرتے
اس دوران چار یا پانچ مرتبہ آفس کے کام سے میرا کراچی آنا ہوا ہے اور اس آنے جانے ہی نے
بہت اردو سکھا دی ہے۔ بولنی تو خیر ابھی بھی نہیں آتی۔'' وہ کافی خوش مزاج اور خوش گفتار تھی۔

''حیدر کی اور میری دوستی نیویارک میں ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ بعد میں بھی پھر ہم ایک د
رابطے میں رہتے تھے۔ میں نیویارک میں ایک اور کمپنی میں جاب کر رہی تھی' جب سات سال پہلے ح

یہاں جاب کی پیشکش کی اور میں نے اس کی آفر قبول کر لی۔" کافی پینے کے دوران وہ اسے اپنی اور حیدر کی دوستی کے بارے میں بتانے لگی۔ اگلے روز وہ ڈنر پر ان کے گھر آئی تھی۔ اسے دی جانے والی مراعات اور پھر توفیق کمال کا اسے اپنے گھر کھانے پر بلانا کمپنی کے لیے اس کی غیر معمولی اہمیت کو بہت اچھی طرح واضح کر رہے تھے۔ کل والے مغربی لباس کے برعکس آج اس نے مکمل طور پر پاکستانی لباس پہن رکھا تھا۔ گرین کلر کے اسٹائلش شلوار قمیص کے ساتھ گرین کلر کا نیٹ کا دوپٹہ جو اس نے گلے میں ڈال رکھا تھا۔ بالوں کو بھی اس نے جیل سے جمانے کے بجائے انہیں کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ میک اپ بھی تھوڑا سا ڈارک کر رکھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس کی تیاری کو سراہ رہی تھی۔ الماس مسکراتے ہوئے پرخلوص اور دوستانہ انداز میں اس کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں جب کہ توفیق کمال کے انداز میں سنجیدگی اور تکلف تھا۔ حیدر کے آفس میں وہ جتنی بے تکلفی سے بیٹھی تھی یہاں وہ اتنی ہی پرتکلف تھی۔ ڈنر کے دوران اور پھر ڈنر کے بعد چائے پیتے ہوئے بھی ایمن ان لوگوں کے ساتھ موجود رہی تھی۔

فاطمہ کے ساتھ بہت اچھی طرح ملنے اور باتیں کرنے کے باوجود وہ اس سے مل کر خوش نہیں ہوئی تھی۔ اسے اس بات نے بہت تکلیف پہنچائی تھی کہ اس کے علاوہ بھی کوئی لڑکی ہے جو حیدر کی دوست ہے اور وہی اس لڑکی کو اپنی کمپنی بھی لے کر آیا تھا۔ جب میں نے اس کے علاوہ کسی لڑکے کو دوست نہیں بنایا تو اس نے میرے علاوہ کسی لڑکی کو دوست کیوں بنایا۔

وہ فاطمہ سے ملنے کے بعد حیدر سے سخت شاکی ہو رہی تھی۔ اگلے تین چار دن اس کی حیدر سے سرے سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے جیلس ہوتے ہوئے یہی سوچا تھا کہ یقیناً وہ فاطمہ کے ساتھ مصروف ہوگا پھر اس کے بعد وہ آٹھ دس روز کے لیے انگلینڈ چلا گیا تھا۔

* * *

آج یونیورسٹی نہیں جانا تھا، اسی لیے وہ صبح ہی آفس آ گئی تھی۔ وہ اپنی گاڑی لاک کر کے آگے قدم بڑھانے والی تھی کہ اسے حیدر کی گاڑی آتی نظر آئی۔ اسے آتا دیکھ کر وہ بے اختیار رک گئی۔ وہ انگلینڈ سے کل شام میں یا رات واپس آیا تھا۔ آج اتنے دنوں بعد اسے دیکھ کر وہ اپنی ساری خفگی بھول گئی تھی۔ اس وقت اسے گاڑی سے اترتا دیکھ کر وہ بس یہ سوچ رہی تھی کہ اس نے ان دس دنوں میں اسے کس قدر یاد کیا ہے وہ اس کے پاس آ گیا تھا۔ "آج صبح ہی آ گئیں؟"

"آج یونیورسٹی نہیں جانا تھا اس لیے۔" وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے اندر آ گئے۔

مارکیٹنگ منیجر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کبھی وہ اس شخص کو یہ بات بتا پائے گی کہ وہ اس کے لیے کس قدر اہم ہے۔ جب وہ پاس ہوتا ہے تو ہر منظر خوب صورت ہوتا ہے اور جب وہ پاس نہیں ہوتا تو کہیں کوئی خوب صورتی نظر نہیں آتی۔

وہ ایک رپورٹ اسٹڈی کر رہی تھی، جب اسے توفیق کمال نے اپنے آفس میں بلایا تھا اس کے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی انہوں نے فائل پر سے نظریں اٹھا کر سنجیدگی سے کہا۔

"ساڑھے گیارہ بجے ہمیں ایک میٹنگ میں چلنا ہے۔ ابھی گیارہ بجے ہیں، تم ٹھیک ساڑھے گیار
پارکنگ میں پہنچ جانا۔" وہ حواس باختہ ان کی شکل دیکھنے لگی۔

"ہمیں؟"

"ہاں، ہمیں۔ تم ساتھ میٹنگ میں چل رہی ہو، یہی بات بتائی ہے میں نے تمہیں۔ اب تم جاؤ۔"

وہ حواس باختہ اس مشکل کا حل لینے حیدر کے پاس بھاگی آئی تھی۔

"کیا بات ہے ایما! کچھ پریشان لگ رہی ہو۔"

"کچھ نہیں، میں بہت پریشان ہوں۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں میٹنگ میں جانے کی بات بتا

"مجھے وہاں پر کیا کرنا ہوگا، مجھے تو کچھ بھی نہیں پتا۔"

"پتا کیسے ہوگا، تم کبھی اس طرح کی کسی میٹنگ میں گئی ہو جو تمہیں کچھ معلوم ہوگا۔ توفیق بھائی بھی ب
جانتے ہیں، انہیں پتا ہے کہ ابھی تم سب کچھ سیکھ رہی ہو اور ان کا تمہیں میٹنگ میں لے کر جانا بھی دراصل تمہ
سیکھنے ہی کا حصہ ہے۔

اس دوران ریفریشمنٹ اور چائے یا کافی وغیرہ سے تم لوگوں کی تواضع کی جائے گی، اسے انجوائے کر
واپس آ جانا۔" وہ اس کے گھبرائے ہوئے انداز پر اسے سمجھانے لگا۔

"واپس آتے وقت وہ راستے میں تم سے میٹنگ میں ہونے والی باتوں کے بارے میں سوال کریں گ
ان کے سوالوں کے تسلی بخش جوابات دے سکو، اس کے لیے ضروری ہے کہ تم میٹنگ کے دوران وہاں مکمل
موجود رہو، گھبرانا نہیں۔ جو وہ پوچھیں اطمینان سے اس کا جواب دینا۔ اگر جواب غلط بھی ہو تو کوئی بات نہیں
تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔" اس کے حوصلہ دینے اور سمجھانے سے اس کی گھبراہٹ ختم ہو گئی تھی پھر جیسا اس
تھا سب کچھ ہوا بھی بالکل ویسا ہی تھا۔

آفس واپس پہنچ کر اس نے اس معرکے کو سر کر لینے پر خود کو شاباش دیتے ہوئے سکون کا سانس لیا
حیدر کو اپنی ساری کارکردگی کی تفصیلی رپورٹ دینے اس کے پاس آ گئی۔

"حیدر بزی تو نہیں ہیں؟" اس نے اس کی سیکریٹری سے پوچھا تو وہ جواباً خوش اخلاقی سے بھرپور مسکر
چہرے پر لاتے ہوئے بولی۔

"بزی تو ہیں لیکن آپ اندر جا سکتی ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے انہوں نے مجھ سے یہ معلوم کرنے کے لی
کہ آپ میٹنگ سے واپس آ گئی ہیں یا نہیں۔" ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا تھا، اس نے تو ہمیشہ ہی اپنے کام
دوران بھی اس کی پروا کی تھی، اس کا دھیان رکھا تھا لیکن پھر بھی وہ اس بات پر نئے سرے سے خوش ہوئی تھی۔

وہ اپنی سیٹ کے بجائے دوسرے کونے پر رکھے صوفوں میں سے ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ سا
اس نے لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا اور وہ اس پر کچھ کام کر رہا تھا۔

"کیا کیا ہوا، یہ نیا تجربہ کیسا رہا؟"

''بہت اچھا' میرے حساب سے میری کارکردگی ''اے پلس'' کی حق دار ہے لیکن یہ آپ سے بات کر لینے کی وجہ سے ہوا ہے' اگر آپ نے مجھے گائیڈ نہ کیا ہوتا تو میرا گریڈ ''F'' ہوتا۔'' وہ اس کی میز کے پاس جا کر رکتے ہوئے جواباً گویا ہوئی۔ وہ بغیر سر اٹھائے ہنس دیا۔

''بیٹھو تم' میں ذرا دس منٹ میں اس کام سے فارغ ہو لوں پھر تفصیلی باتیں کرتے ہیں۔'' وہ اس کی میز کے سامنے مہمانوں کے لیے رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھنے لگی تھی کہ اچانک اسے ایک شرارت سوجھی۔ وہ بجائے وہاں بیٹھنے کے اس کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کے بعد سیٹ کو دائیں بائیں گھماتے ہوئے وہ اپنی اس بچکانہ حرکت پر محظوظ ہوتے ہوئے ہنسنے لگی۔ اس کی مدھم سی ہنسی اس نے فوراً سنی اور متعجب سے انداز میں سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

''میں یہاں بیٹھ کر کیسی لگ رہی ہوں؟'' ''بہت اچھی۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''میں یہاں تک کب پہنچوں گی؟'' اپنے ہاتھوں میں چہرہ ٹکاتے ہوئے اس نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

''تمہاری رفتار دیکھ کر تو لگ رہا ہے دو چار سال میں ہی تم مجھے ہٹا کر یہاں میری جگہ پر بیٹھی ہو گی۔'' وہ مسکراتے ہوئے خوش دلی سے بولا۔

''تم نے کام کرنے کا میرا موڈ ختم کروا دیا ناں۔'' وہ لیپ ٹاپ کو اسی حالت میں میز پر رکھا چھوڑ کر صوفے پر سے اٹھ کر میز کے پاس آ گیا۔ وہ اسے آتا دیکھ کر اس کی سیٹ پر سے اٹھنے لگی تھی کہ وہ ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے فوراً بولا۔

''بیٹھی رہو اچھی لگ رہی ہو۔'' وہ جواباً کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ اسی وقت اس کی سیکریٹری نے اسے انٹرکام پر کسی کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ریسیور اٹھایا تھا مگر آنے والا پتا نہیں کون تھا جس کا نام سنتے ہی اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔

''ان سے کہیے' میں آج سارا دن بزی ہوں۔ ان سے بالکل نہیں مل سکتا۔'' اس کا حکمیہ لہجہ کچھ سختی لیے ہوئے تھا۔ وہ میز کے دوسری طرف رکھی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ زوردار دھماکے کے ساتھ کھلا۔ حیدر نے بڑی ناگواری سے دروازے کی طرف دیکھا۔

ایمن نے ایک نظر کمرے میں داخل ہوتی بجیلہ کو اور پھر ایک نظر حیدر کو دیکھا۔ بجیلہ نے اندر آنے کے بعد دروازہ اسی زوردار انداز سے بند کیا۔

''تو یہ ہے تمہاری وہ مصروفیت جس کی وجہ سے تم مجھ سے مل نہیں سکتے۔'' اس نے ایمن کو ان نگاہوں سے گھورا جیسے اسے کچا چبانے کا ارادہ ہو۔ حیدر بہت غصے سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''کیوں نہیں بات کرو گے تم مجھ سے' تمہیں مجھ سے بات کرنی پڑے گی۔ میں پچھلے پانچ مہینوں سے اپنا گھر اور اپنا شہر چھوڑ کر تمہارے پیچھے خوار ہو رہی ہوں' صرف تمہاری وجہ سے اتنے مہینوں سے کراچی میں ہوں اور تم کہہ رہے ہو کہ مجھ سے بات نہیں کرو گے۔'' وہ تیز آواز میں چلائی۔ پکنک پر جس بجیلہ بابر کو اس نے دیکھا تھا وہ آج اس سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔

ان دونوں کی اس گفتگو میں اس کی موجودگی بالکل مناسب نہیں تھی۔ وہ سیٹ پر سے اٹھی اور بجیلہ
سے تیزی سے گزر جانا چاہا کہ اچانک ہی بجیلہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے جانے سے روک لیا۔ وہ ا
نفرت سے دیکھ رہی تھی۔

''تمہیں تمہاری عمر کا کوئی لڑکا نہیں مل رہا تھا جو اس کے پیچھے پڑی ہو۔ دولت سے اس کی متاثر ہو
کیونکہ تمہارے باپ کے پاس خود بہت دولت ہے۔'' اس کے لہجے میں نفرت اور حقارت تھی۔

''بجیلہ!'' حیدر کی آواز کافی بلند تھی۔ ''مزید تم کوئی بکواس نہیں کرو گی۔'' اس نے حیدر کو اس طر
ہوئے کبھی نہیں سنا تھا۔

''کیوں چپ رہوں میں' تمہیں میری باتیں بکواس لگیں یا جو بھی' مگر تمہیں سننا پڑے گا حیدر مسعود
لڑکی کی وجہ سے نظر انداز کر رہے ہو ناں تم! اس کی کم عمری اور معصومیت نے تمہیں اپنا اسیر بنا لیا ہے۔ اپنے
تیرہ سال چھوٹی لڑکی سے محبت میں مبتلا ہو' تمہاری زندگی میں اب بجیلہ بابر کی……'' حیدر کی غراہٹ
اپنی بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

''آگے ایک لفظ مت بولنا بجیلہ!

شائستہ! آپ اندر آیئے۔'' اس نے فوراً انٹرکام پر اپنی سیکریٹری کو اندر بلایا۔ وہ خوف زدہ سے
ایک سیکنڈ میں اندر آ گئی تھی۔

''میرے…… منع کر دینے کے باوجود یہ محترمہ میرے آفس میں کیوں آئی ہیں؟ یہ میں آپ کو پہلی
وارننگ دے رہا ہوں' آج کے بعد اگر یہ خاتون کبھی میرے آفس میں آئیں تو میرے پاس آپ کی
کوئی گارنٹی نہیں ہو گی۔'' بجیلہ کا سارا جوش اور غصہ ایک دم ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اسے احساس
اب بھی وہ وہاں سے نہیں گئی تو شاید وہ اسے چوکیدار سے دھکے لگوا کر اپنے آفس سے نکال دے گا۔
خوردہ قدموں سے تیزی سے واپس پلٹی اور کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔

''آئم سوری سر!'' اس کی سیکرٹری کانپتے ہوئے بولی۔

''آپ جا سکتی ہیں۔'' اس کے جانے کے بعد وہ ایمن پر نظریں ڈالے بغیر واپس کرسی پر بیٹھ گیا
اس پل حیدر مسعود کی خاموشی سے خوف محسوس ہوا۔ اس نے ایک گلاس میں پانی نکالا اور آہستہ آہست
اس کی کرسی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

''آپ پانی پی لیں۔'' اس کی آواز پر بھی اس نے اپنا سر اوپر نہیں اٹھایا تھا۔

''تم یہاں سے جاؤ۔'' اس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ ''میں اس طرح سے کیسے……''

''میں نے تم سے کہا ہے ناں کہ تم یہاں سے جاؤ۔'' اس بار اس کے لہجے میں پہلے سے بھی زیادہ اج
وہ ایک نظر اس پر ڈال کر پانی کا گلاس میز پر رکھنے کے بعد باہر آ گئی۔ اسے بجیلہ کی کسی بات نے ہر
نہیں لیکن حیدر کی بات نے ضرور کیا تھا۔ اس کی کوئی غلطی نہیں تھی اور پھر بھی اس نے اتنے خشک اندا

اپنے کمرے سے نکال دیا تھا۔ وہ اس بات کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ رات کو بستر پر لیٹنے کے بعد عجیب سے دکھ نے خود بخود ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر دیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

* * *

وہ حیدر کے فون کا انتظار کر رہی تھی۔ آفس میں سارا وقت وہ اپنے بلائے جانے کی منتظر رہی۔ شام میں وہ اسے نظر آ ہی گیا۔ کوریڈور میں ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" ایک سرسری سی نظر اس پر ڈال کر اس نے اس کے سلام کا جواب دیا اور فنانس ڈائریکٹر کے ساتھ گفتگو کرنے لگا جو اس کے ساتھ ہی تھا۔

اس کا دل چاہا' وہ وہیں کوریڈور میں زور زور سے رونا شروع کر دے' وہ کل کی طرح غصے میں نہیں تھا پھر اس نے اسے اس طرح نظرانداز کیوں کیا۔ اس کی زندگی میں بہت سارے رشتے نہیں تھے جو وہ ایک کی طرف سے توجہ میں کمی آ جانے پر دوسری طرف متوجہ ہو جاتی۔ اس کے پاس بس یہی ایک رشتہ تھا اعتبار کا' دوستی کا' زندگی کی سب محرومیوں اور ساری تلخیوں کے ساتھ اس نے سمجھوتہ کر لیا تھا' صرف اس لیے کہ اس کے پاس خلوص' محبت اور یقین کا ایک انمول رشتہ موجود تھا۔ اس ایک شخص نے دوسرے سب رشتوں کی کمی کو پورا کر دیا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں خوشیوں کو لے کر آیا تھا۔ اس کی ہر سوچ اس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتی تھی پھر جب وہ یوں اجنبی اور لاتعلق ہو رہا تھا تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے زندگی میں سے ساری خوشیاں ہی نکل گئی ہوں۔

"میں تم سے سخت نفرت کرتی ہوں جبیلہ بابر! تم نے ہمارے بیچ یہ دوری اور فاصلہ پیدا کیا ہے۔" وہ ہر روز دن میں کئی مرتبہ جبیلہ بابر کو نفرت سے یاد کرتی۔ ہر روز وہ اس کے فون کا انتظار کرتی تھی۔

"میرے ساتھ یوں مت کرو حیدر!" وہ ہر رات روتے ہوئے سوتی تھی۔

* * *

ایک مہینہ گزر چکا تھا اسے حیدر کی بیگانگی اور لاتعلقی کو برداشت کرتے ہوئے۔ اس دوران وہ نیویارک بھی ہو آیا تھا۔ نہ وہ جاتے وقت اس سے ملا تھا' نہ اس نے وہاں سے اسے فون کیا تھا' نہ کوئی ای میل بھیجی تھی اور نہ ہی واپس آنے کے بعد اسے فون کیا تھا۔

"کیا میری زندگی میں آنے والا ہر رشتہ یونہی مجھ سے چھین لیا جائے گا۔" اس رات روتے ہوئے کتنے شکوے اس کے لبوں سے نکلے تھے۔

وہ توفیق کمال کے ساتھ کسی ڈنر میں شرکت کر کے ان کے ساتھ ان کے گھر آیا تھا۔ وہ دونوں اسٹڈی میں بیٹھے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا' اسے دیکھے' وہ اس کی آواز سنے۔ دین محمد ٹرے میں کافی کے کپس اور ڈرائی فروٹس کی پلیٹ سجائے سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا کہ اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر ٹرے اس کے ہاتھ سے لے لی۔ پاپا کو کافی میں دے آتی ہوں دین محمد!" وہ قصداً مسکرائی۔ وہ اسٹڈی میں داخل ہوئی تو وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھے نظر آئے۔ پین ہاتھ میں لیے وہ بڑی سنجیدگی سے توفیق کمال سے کوئی بات کر رہا تھا۔ ان دونوں نے دروازہ کھول کر اس کے اندر آنے کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ اپنی گفتگو میں بہت مگن تھے۔ اس نے حیدر کو سلام کیا تو

ان دونوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" اور پھر اپنی نظریں فائل پر مرکوز کر دی تھیں۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی اس پر تو
دی تھی۔ اس کے مزید وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے اسٹڈی سے باہر آ گئی۔

"جب تم نے مجھے سب کچھ سکھایا ہے تو اپنے بغیر زندہ رہنا بھی سکھا دو۔ میں تمہارے بغیر زندہ رہنا بھ
ہوں۔" وہ ساری رات شکوے کرتی رہی۔ اس سے بھی' خود سے بھی' اپنی قسمت سے بھی۔ صبح نہ وہ یونیورسٹ
اور نہ ناشتے کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر۔ توفیق کمال اور الماس کے آفس چلے جانے کے بعد بھی وہ یونہی لیٹی
لیٹے لیٹے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کا ریسیور اٹھایا اور بے خودی کے عالم میں اس کا موبائل نمبر ملایا۔

"ہیلو۔" اس کی آواز سنتے ہی اس نے گھبرا کر فوراً لائن کاٹ دی تھی۔ اس کے ریسیور واپس رکھتے ہی
بیل بجنی شروع ہوئی۔ آنے والا نمبر حیدر مسعود کا تھا۔

"ہیلو۔" کافی دیر کے بعد اس نے ریسیور اٹھایا تھا۔

"تم نے بغیر بات کیے فون کیوں بند کر دیا؟" اس کے ہیلو کے جواب میں اس نے بہت سنجیدگی سے
کتنے دنوں بعد اس کے سلام کا جواب دینے کے علاوہ اس نے اس سے کوئی بات کی تھی۔ یہ ایک مہینہ یوں
تھا جیسے ایک صدی ہو۔ وہ اس وقت سوائے رونے کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس نے بغیر
ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

"حیدر صاحب آئے ہیں۔" اسے روتے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی جب دین محمد نے اسے یہ
دی۔ وہ بے یقینی اور خوشی کے عالم میں اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ
کھول کر اندر آئی تو اسے دروازے ہی کی طرف دیکھتا ہوا پایا۔

"تم آج یونیورسٹی نہیں گئیں؟" اس کے فون بند کر دینے کے بارے میں کوئی بات کیے بغیر وہ ای
متعلقہ بات پوچھنے لگا۔

"نہیں۔" وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آج تمہاری کلاسز آف تھیں یا طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

"آج کلاسز بھی تھیں اور میری طبیعت بھی بالکل ٹھیک ہے۔" اس کی بھیگی ہوئی آواز میں ڈھیر س
شکوے چھپے ہوئے تھے۔

"پھر تم یونیورسٹی کیوں نہیں گئیں؟ تمہارے امتحانوں میں کتنے کم دن رہ گئے ہیں۔ آخری دنوں
لاپروائی؟" وہ ناراضی سے یوں مخاطب تھا جیسے اس کے نزدیک اس کی پڑھائی سے زیادہ دوسری کوئی چیز ا
تھی۔ "جس کارکردگی کی میں تم سے توقع کر رہا تھا تم اس کا مظاہرہ نہیں کر رہی ہو۔ تمہارے ساتھ آخر
ہے؟" وہ بڑی خفگی کے ساتھ اس کی لاپروائیوں اور غلطیوں پر اسے سرزنش کرنے لگا۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ ہوا تو آپ کو ہے۔" پڑھائی اور آفس سے متعلق اس کی بے موقع بازپرس نے
بہت دکھ میں مبتلا کیا تھا۔

”مجھے کیا ہوا ہے؟“ اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔ آپ کو کیا ہوا ہے۔ آپ مجھ سے کس بات پر ناراض ہیں، آخر میرا قصور کیا ہے؟“ وہ خود کو رونے سے مزید روک نہیں پائی تھی۔

”تم سے کس نے کہا کہ میں تم سے ناراض ہوں اور میں تم سے ناراض ہوں گا بھی کیوں؟“ وہ تردیدی انداز میں بولا۔

”جھوٹ مت بولیں، آپ اتنے دنوں سے مجھے اگنور کر رہے ہیں، سلام کا جواب دینے کے علاوہ کوئی بات نہیں کرتے۔ حالانکہ آفس میں اس روز جو کچھ بھی ہوا، اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے بولی۔

”بے وقوف لڑکی! میں تم سے نہ ناراض تھا اور نہ ناراض ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ احمقانہ خیال تمہارے دماغ میں آیا کیوں۔“ اس کے لہجے میں وہی اپنائیت در آئی تھی جس کی وہ عادی تھی۔

”واقعی، آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں؟“ اس نے اس اپنائیت بھرے لہجے پر بے یقینی سے پوچھا۔

”ناراض ہونے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔ میں کیا پاگل ہوں جو بے وجہ تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔“

”کبھی کوئی وجہ ہو تب بھی مجھ سے ناراض مت ہوئیے گا۔ میری زندگی میں آپ کے علاوہ کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے میری پروا ہو۔“

”اس طرح سے نہیں کہتے ایما۔“ وہ سامنے والے صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

”تمہارے پاس بہت سارے رشتے ہیں۔ تمہارے پاپا ہیں، تمہارا بھائی ہے، ان دونوں سے تمہارا خونی رشتہ ہے۔“ اس نے اس کے چہرے پر سے اس کے ہاتھوں کو ہٹا دیا تھا۔

”پاپا....؟ ہاں، وہ ہیں مگر وہ میرے پاس نہیں ہیں۔ جب تک میں ان کے معیار پر پوری نہیں اتری تھی، انہیں نہ میری کوئی ضرورت تھی، نہ مجھ سے کوئی مطلب۔ میری آؤٹ اسٹینڈنگ کارکردگی اور ذہانت نے انہیں مجھ پر توجہ دینے پر مجبور کیا ہے۔ اب وہ مجھ سے بات بھی کرنے لگے ہیں۔ مجھے اپنے آفس بھی بلانے لگے ہیں۔ کیونکہ میں نے ان کی نظروں میں خود کو اس قابل ثابت کر دیا اور اگر میں ایسا نہ کر پاتی تو کہاں ہوتی؟ اور بھائی، اس سے ملی ہوئی محبت آپ کی مرہون منت ہے، ورنہ میں اس کے لیے ایک عام سی ہی لڑکی تھی۔“

”توفیق بھائی اور سائر تم سے بہت پیار کرتے ہیں ایما! اس بارے میں سارے شکوک اپنے دل سے نکال دو اور میں.... میں تو تمہارے ساتھ ہوں ہی۔ ہم کل بھی دوست تھے، ہم آج بھی دوست ہیں اور ہم ہمیشہ دوست رہیں گے۔ میں تم سے ناراض نہیں تھا ایما! میں صرف تم سے شرمندہ تھا۔ جمیلہ نے اس روز جو کچھ بھی کہا، میں اس پر تم سے شرمندہ تھا۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بہت آہستگی سے بولا۔

”مجھے ان کی کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ مجھے نہیں پتا آپ کی زندگی میں ان کی کیا اہمیت ہے مگر میری زندگی میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ان کا جو دل چاہے، سوچتی اور کہتی رہیں، میں پروا نہیں کرتی۔“ اس نے تیز لہجے میں حیدر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”غلطی میری ہے، میں اتنے مہینوں سے اگنور کر کے سمجھ رہا تھا کہ وہ مایوس ہو کر خود ہی واپس چلی جا
نے پکنک پر دیکھا تھا نا، میں اس سے کس طرح ملا تھا۔ وہ فون کرتی تھی تو اس کی کال ریسیو نہیں کرتا تھا۔ آ
تو میں ملتا نہیں تھا۔ اگر مجھے یہ اندازہ ہوتا کہ وہ اس طرح کرے گی تو میں نظرانداز کرنے والی پالیسی ترک
ذرا سنجیدگی سے اسے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا لیکن خیر جو ہو چکا، وہ تو ہو چکا ہے۔ آگے کے لیے یہ میرا
وعدہ ہے کہ تم جمیلہ بابر کے ہاتھوں دوبارہ کبھی کوئی تکلیف نہیں اٹھاؤ گی۔“ اس کا لہجہ بہت مضبوط اور ہمو
چند لمحے وہ دونوں یونہی خاموش بیٹھے رہے۔

”اب میں جاؤں؟“ اس نے اس کی طرف دیکھا اور اس نے سر ہلا دیا۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر وہ ا
ساتھ باہر آ گئی۔

”اب بالکل صحیح پڑھائی کرنی ہے، خوب دل لگا کر۔ تمہیں پتا ہے نا، میں تمہیں کہاں دیکھنا چاہتا ہ
پورچ کی طرف آتے ہوئے وہ اس سے بولا۔

”تم نے ایم بی اے کے لیے Apitude test کی تیاری بھی شروع کر دی تھی، اس کا کیا ہوا؟
گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”کر رہی ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ اس نے بغور ایمن کی طرف دیکھا۔

”یہ سر جھکا کر ”کر رہی ہوں“ کہنے کا مطلب مجھے پتا ہے۔ اگلی بار میں تم سے یہ سوال پوچھوں تو کوش
میری طرف دیکھ کر جواب دے سکو۔ ابھی نیویارک سے آتے ہی عابد صاحب نے تمہارے بارے میں
تفصیلی اور مایوس کن رپورٹ دی ہے۔ بیلنس شیٹ میں جو تم نے گڑبڑ مچائی تھی، وہ انہوں نے مجھے دکھائی
کہہ رہے تھے کہ مس ایمن ذہین ہیں مگر کام میں دلچسپی نہیں لے رہیں۔“ دھیمے لہجے میں سرزنش کر رہا تھا
جھکا کر شرمندگی مٹا رہی تھی۔

* * *

وہ ایک مرتبہ پھر اپنی پڑھائی اور آفس کی مصروفیات میں مگن ہو گئی تھی۔ جمیلہ کی اس روز کی باتیں، ا
ردعمل کے طور پر حیدر کا اسے اتنے دنوں تک نظرانداز کرنا، وہ ان تمام باتوں کو یکسر فراموش کر چکی تھی۔
وہ پھر اس کے ساتھ ویسا ہی ہو چکا تھا جیسے پہلے تھا تو وہ بھی پچھلی کسی بات کے بارے میں سوچ کر خو
دکھ میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے امتحانوں میں بہت کم دن رہ گئے تھے۔ وہ پوری سنجیدگی س
پڑھائی میں مصروف ہو چکی تھی۔ توفیق کمال کئی مرتبہ اسے اپنے ساتھ مختلف میٹنگز میں لے جا چکے تھے۔
میٹنگز میں پورے اعتماد کے ساتھ جاتی تھی۔ اسے وہاں جا کر صرف خاموش بیٹھنا ہوتا تھا اور یہ کوئی مشکل ک
تھا۔ امتحانوں سے چند دن پہلے ہی سے اس نے آفس آنا چھوڑ دیا تھا اور پھر امتحانوں کے دوران بھی
نہیں گئی تھی۔ حیدر سے بھی فون کی حد تک ہی رابطہ تھا۔ امتحانوں کے بعد اس نے باقاعدہ اور باضاب
آفس جوائن کر لیا تھا۔ اس کے سیکھنے کی رفتار سے توفیق کمال بہت مطمئن تھے۔ ایک دو بار انہوں نے سرس
انداز میں اس کی یہ کہہ کر تعریف بھی کی تھی کہ وہ کام سیکھنے میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔ اول تو ان

سے اتفاقاً ہی کسی کے لیے کوئی تعریفی جملہ نکلتا تھا اور اگر یہ اتفاق ہو ہی جاتا تھا تو پھر جس کی تعریف کی گئی ہوتی تھی، وہ سو فیصد اس تعریف کا حقدار ہوتا تھا۔ اس کا ایم بی اے کے رجحان ٹیسٹ کا رزلٹ اس کے ماسٹرز کے رزلٹ سے پہلے آ چکا تھا۔ توقع کے عین مطابق وہ وہاں پر داخلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ حیدر نے پھول اور کارڈ دے کر اسے اس کامیابی پر مبارکباد دی جبکہ توفیق کمال کے اس کے ساتھ رویے میں پہلے سے بھی زیادہ تبدیلی آ گئی تھی۔

* * *

وہ آفس میں تھی جب رامین نے اسے یونیورسٹی سے فون کر کے رزلٹ کے بارے میں بتایا۔ وہ اس سے بات کر کے بھاگتی ہوئی حیدر کے پاس آئی تھی۔

"آپ کو پتا ہے۔"

"پہلے سانس بحال کر لو پھر بولنا۔ مجھے تمہاری بات سنے بغیر کہیں نہیں جانا۔" اس نے اسے فوراً ٹوکا۔

"ابھی رامین کا فون آیا تھا۔ ہمارا رزلٹ آ گیا۔" حیدر کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ ابھری تھی۔

"کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا مجھے کہ یہی بات ہو گی۔ ویسے تو مجھے پتا ہے کہ کیا ہوا ہو گا پھر بھی میں یہ بات تمہارے منہ سے سننا پسند کروں گا۔" وہ اتنی دیر میں اپنی سانسیں ہموار کر چکی تھی اس لیے اس بار بہت سکون اور اطمینان سے اسے جواب دیا۔

"میں نے صرف اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن نہیں لی ہے بلکہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں بھی میری پہلی پوزیشن ہے۔ اور پوری فیکلٹی میں میری دوسری پوزیشن ہے۔"

وہ جواباً بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔

"مجھے تم سے اسی کارنامے کی توقع تھی، تب ہی تو میں نے تمہارے لیے گفٹ بھی پہلے ہی سے خرید کر رکھا ہے۔ افسوس وہ گھر پر رکھا ہے۔ ورنہ میں ابھی تمہیں دیتا۔" وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اتنی خوشی تھی جتنی خود ایمن کے چہرے پر بھی نہیں تھی۔

"تم نے توفیق بھائی کو بتایا؟" وہ اس سے گفٹ کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ اس کے پوچھنے سے پہلے ہی بولا۔

"نہیں، میں نے ابھی اور کسی کو نہیں بتایا۔" اس کے حساب سے حیدر مسعود کے لیے یہ بات بہت خوشی اور فخر کا باعث ہونی چاہیے تھی کہ وہ اسے اپنی زندگی میں کسی بھی دوسرے فرد سے زیادہ اہمیت دیتی ہے مگر وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"تمہیں سب سے پہلے توفیق بھائی کو بتانا چاہیے تھا ایمن! ہماری کامیابیوں کے بارے میں جاننے کا سب سے پہلا حق ہمارے والدین کا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان سے زیادہ ہماری کامیابیوں پر دوسرا کوئی بھی شخص خوش نہیں ہو سکتا۔" اسے حیدر کی یہ بے موقع نصیحت بالکل نہیں بھائی تھی مگر وہ اس سے اختلاف کر کے اپنا اور اس کا م خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"جاؤ جا کر توفیق بھائی کو بتا کر آؤ۔ دیکھنا وہ کس قدر خوش ہوں گے۔ میں آفس میں ہی ہوں۔ انہیں بتا میرے پاس آ جانا۔ پھر ہم ساتھ بیٹھ کر اس خوشی کو سیلیبریٹ کریں گے۔" وہ بہت بردباری سے سمجھا کر جیسے مسکرایا۔

"جلدی سے جاؤ۔ شاباش....." وہاں جانے پر ان کی سیکرٹری سے پتا چلا کہ اس وقت ان کے پاس کچ غیر ملکی مہمان آئے بیٹھے ہیں۔ اس نے ان سے انٹرکام پر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"بولو ایمن....." اس کی آواز سن کر انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میرا رزلٹ آ گیا ہے اور میں....." وہ جواباً سنجیدگی سے انہیں یہ خبر دینے لگی تھی کہ وہ بے ساختگی سے اس کی بات کاٹ کر بولے۔

"رزلٹ کی خبر انٹرکام پر دے رہی ہو۔ اندر آ جاؤ۔" وہ اس جواب کی امید نہیں کر رہی تھی اسی لیے حیران ہو اندر آ گئی۔

"یہ میری بیٹی ہے۔ ام ایمن۔" انہوں نے سامنے بیٹھے تینوں افراد سے اس کا تعارف کروایا تھا۔

"ہاں اب بتاؤ کیا ہوا؟" وہ اپنے مہمانوں سے نظریں ہٹا کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے۔

"میں نے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں فرسٹ پوزیشن لی ہے اور پوری فیکلٹی میں دوسری۔" وہ انہیں بہت سنجی انداز میں یہ خبر سنا رہی تھی۔ وہ اس کی بات سن کر اس انداز میں مسکرائے تھے جیسے انہیں اس سے یہی اطلاع مل کی امید تھی۔ ان کی مسکراہٹ فخریہ تھی۔ اس نے ان کے چہرے پر اپنے لیے یہ مسکراہٹ پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ اپنے مہمانوں کو انگریزی میں وہ بات بتانے لگے تھے جو اس نے ابھی ان سے اردو میں کہی تھی۔

"بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔" ان میں ایک نے فوراً مسکراتے ہوئے انہیں مبارکباد دی۔

"شکریہ....." وہ جواباً خوشگوار انداز میں مسکرا دیے۔

"میری بیٹی بہت ذہین ہے۔ بہت محنتی اور قابل، میں اس سے ایسے ہی رزلٹ کی امید کر رہا تھا۔" ان کے لہجے میں اس کے لیے فخر اور محبت تھی۔

"میری بیٹی" انہوں نے اس انداز میں کہا تھا جیسے ام ایمن کا ان کی بیٹی ہونا ان کے لیے بہت خوشی او مسرت کا باعث ہے۔ پہلی مرتبہ وہ اتنے فخر کے ساتھ اس کا ذکر کر رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ توفیق کمال کی بیٹی ہے۔ وہ زینب بشیر کے ہاتھوں پرورش پانے کے باوجود ہو بہو اپنے باپ جیسی ہے۔ توفیق کمال جیسی۔ انہیں اپنے بزنس کے ان معاملات میں اب قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی جن پر وہ اس کے آنے سے پہلے تک اپنے غیر ملکی مہمانوں سے گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے لیے اس وقت اہم تھی ام ایمن۔ ان کی بیٹی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"مجھے تم پر فخر ہے ایمن!" ان کی نگاہیں اس سے یہ بات کہہ رہی تھیں۔ اگر آج امی زندہ ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں۔

انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس رکھی کرسی پر بٹھا لیا تھا۔ وہ توفیق کمال کے برابر بیٹھی تھی۔

"پرسوں ایک شاندار سی پارٹی رکھ رہا ہوں میں ایمن! تم اپنے سب دوستوں کو انوائیٹ کر لو۔ تمہار

کامیابی کو میں بہت اچھی طرح سیلیبریٹ کرنا چاہتا ہوں۔ پارٹی میں پہننے کے لیے بہت خوب صورت سا ڈریس آج ہی خرید لو اور آفس سے چھٹی کر کے اپنے فرینڈز کے ساتھ آج کے دن کو اچھی طرح انجوائے کرو۔'' انہوں نے اپنے والٹ میں سے بہت سارے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ وہ خود بھی جواباً مسکرا دی۔ وہ اسے اپنے سے بہت دور اور بہت بلندی پر کھڑے نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ ان کے برابر میں کھڑی تھی۔ توفیق کمال کی بیٹی ام ایمن پورے فخر کے ساتھ اپنے باپ کے برابر میں کھڑی تھی۔

* * *

فنکشن کے لیے اس نے اپنی تیاری پر بھرپور توجہ دی تھی۔ بہت غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد اس نے اپنے لیے لباس خریدا۔ وہ اپنے بیوٹی سیلون سے پارٹی میک اپ کروا کر آئی تھی۔ اتنا مکمل میک اپ اس نے پہلی مرتبہ کیا تھا اسی لیے خود بھی اپنے آپ کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔

بائیں ہاتھ میں خود ڈھیر ساری کانچ کی سیاہ اور سرخ چوڑیاں پہنی تھیں جب کہ دائیں ہاتھ میں حیدر کا گفٹ میں دیا ہوا قیمتی بریسلٹ پہنا تھا یہ گولڈ کا بے حد خوب صورت اور بیش قیمت بریسلٹ اس نے ایمن کو پرسوں رات بی بی کے ساتھ ان کے گھر پر آ کر دیا تھا۔

وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو سب سے پہلے الماس سے اس کا سامنا ہوا۔ انہوں نے بے ساختہ اس کی تعریف کی۔

''سائر کا فون آیا تھا۔ بہت اداس ہو رہا تھا کہ میں آپ سب سے اتنا دور ہوں کہ چاہنے کے باوجود اس پارٹی میں شرکت نہیں کر سکتا۔''

''میرے پاس بھی اس کی E-mail آئی ہے۔ ایمن! میں آپ کے پاس اڑ کر آنا چاہتا ہوں' کاش میرے پر ہوتے۔'' وہ مسکراتے ہوئے انہیں سائر کی میل کے بارے میں بتانے لگی۔ وہ ہنستے ہوئے سیڑھیوں کی طرف چلی گئیں۔

توفیق کمال نے پارٹی کے انتظامات بہت شاندار کروائے تھے۔ انہوں نے پارٹی میں اپنے تمام دوستوں او دیگر احباب کو مدعو کیا تھا۔

اور ایک بڑی تعداد ایسے دوستوں اور ان کی فیملیز کی بھی تھی' جن سے وہ پہلی مرتبہ مل رہی تھی۔

''یہ جاوید غیاث ہیں۔ بزنس کے حوالے سے تو ہمارا آپس میں تعلق ہے ہی مگر بزنس سے علاوہ بھی ہم آپس میں بہت اچھے دوست ہیں۔ یہ ان کی مسز ہیں اور یہ ان کا بیٹا ہے شہیر جاوید۔'' انہوں نے اپنے ایک دوست او اس کی فیملی کا استقبال کرتے ہوئے اس کا ان لوگوں سے تعارف کروایا۔ اس نے مسکراتے ہوئے ان لوگوں کو خوش آمدید کہا۔ ان کی بیگم نے ایمن کے ہاتھ میں گفٹ دیتے ہوئے اسے مبارکباد دی۔

''آخر بیٹی کس کی ہے۔ اسے اسی طرح کا کوئی غیر معمولی کام ہی کر کے دکھانا تھا۔'' جاوید غیاث نے ہنستے ہوئے اپنی بیگم سے کہا۔

توفیق کمال اس تعریف پر خوش دلی سے مسکرائے۔

شہیر جاوید کی خود پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد پڑنے والی نگاہوں کو اس نے محسوس کیا تھا اور اسے اس بات پر

خاص حیرت نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت پارٹی میں موجود بہت سارے لوگ اسے بہت توجہ سے دیکھ رہے وہ توفیق کمال کی بیٹی تھی' وہ بے تحاشا ذہین تھی۔ اور وہ آج بے حد خوبصورت بھی لگ رہی تھی۔

وہ رامین وغیرہ کی باتوں پر مسکراتے ہوئے آگے بڑھی تو سوفٹ ڈرنک کا گلاس ہاتھ میں لیے شہیر ا پاس آ گیا۔ وہ اسے اپنے پاس آتا دیکھ کر اخلاقاً مسکرائی۔

''انکل بتا رہے ہیں کہ آپ MBA کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی آپ نے باقاعد آفس بھی جوائن کر لیا ہے؟'' اس کا استفہامیہ انداز شائستگی لیے ہوئے تھا۔

''جی.....'' وہ مختصر سا جواب دے کر چپ ہو گئی۔

''دیکھنے سے لگتا نہیں ہے' اصل میں ہمارے ہاں بزنس ایڈمنسٹریشن وغیرہ پڑھنے کی طرف لڑکیاں ذر جاتی ہیں۔ شاید یہ سبجیکٹس انہیں مشکل لگتے ہیں۔'' وہ جواباً رسمی انداز میں مسکرائی۔

''آپ بہت کم بولتی ہیں' ویسے کہا بھی یہی جاتا ہے کہ ذہین لوگ بولتے کم ہیں سوچتے زیادہ ہیں۔''

''آپ کیا کرتے ہیں؟'' اس نے اپنے بارے میں اسے مزید کوئی تبصرہ کرنے کا موقع دیے بغیر ا پوچھا۔

''میں اپنے بڑے تینوں بھائیوں کی طرح ڈیڈی کے ساتھ ہمارے فیملی بزنس میں شامل ہوں۔ ایک ہوا مجھے بزنس میں آئے ہوئے۔ اس سے پہلے لندن پڑھنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ ابھی تک یہاں کے کار طور طریقوں کے مطابق خود کو زیادہ اچھی طرح ڈھال نہیں سکا۔

ڈیڈی پچھلے ایک سال سے مجھے یہ بات سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کاروباری دوستوں کو وقتاً فو پاس لنچ اور ڈنرز وغیرہ کے لیے مدعو کرتے رہنا چاہیے اور ان کی طرف سے دی گئی پارٹیوں اور ڈنرز میں بھی طور پر شرکت کرنی چاہیے۔'' وہ اسے جواب دیتے ہوئے تھوڑا سا مسکرایا۔

''لیکن آپ کی سمجھ میں ان کی بات نہیں آ رہی۔'' وہ جواباً گویا ہوئی۔

''بالکل نہیں آ رہی۔ آج یہاں بھی ڈیڈی کے کہنے پر بغیر موڈ کے آیا تھا۔ لیکن اب آنے کے بعد ا ہو رہا ہے کہ آج یہاں نہ آتا تو بہت بڑی غلطی کرتا۔ شاید اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی۔'' وہ براہ راس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

''پاپا کی دی ہوئی پارٹیز ہمیشہ ہی شاندار ہوتی ہیں۔'' وہ پراعتماد انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بول کے معنی خیز انداز اور نگاہوں پر نروس ہونے یا ادھر ادھر دیکھنے کے بجائے وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں مسکرائی تھی۔

''معاف کیجیے گا میں ذرا باقی مہمانوں سے مل لوں۔'' اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بول کر گفتگو کو طول کی کوشش کرتا وہ شائستگی سے معذرت کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی' وہ سب لوگوں سے مل رہی تھی۔ باتیں تھی۔ مگر اس کی نگاہیں بے چینی سے کسی کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔

حیدر اور بی بی کو اندر آتے دیکھ کر اس کا انتظار تو ختم ہو گیا مگر ساتھ ہی ناراضی نے اسے اپنی لپیٹ م

لیا۔ ”اتنی دیر سے آئے ہیں آپ لوگ۔ میں کب سے انتظار کر رہی تھی۔“

”میں بالکل ٹھیک ٹائم پر تیار ہو گئی تھی بیٹا! حیدر کا ایک فون آ گیا تھا۔ بس اسی وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔ ویسے اگر تم حیدر سے دیر ہونے پر لڑنا چاہتی ہو تو ضرور لڑو کیونکہ دیر اسی کی وجہ سے ہوئی ہے۔“ بی بی نے اسے گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے گفٹ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ”بہت پیاری لگ رہی ہو۔ بالکل نازک سی گڑیا جیسی۔“

بی بی کی تعریف پر وہ مسکرا دی۔

الماس نے بی بی اور حیدر کی طرف دیکھ لیا تھا اور وہ مسکراتے ہوئے فوراً ان لوگوں کے استقبال کے لیے چلی آئیں۔ الماس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ توفیق کمال نے بھی انہیں دیکھ لیا۔ حیدر اور بی بی ان کے لیے جتنے خاص الخاص تھے تو ان کا تو انہیں والہانہ انداز میں اور بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کرنا ہی تھا۔ حیدر سب لوگوں سے ملنے ملانے میں مصروف ہو گیا۔

اسے اس کے اس درجہ سوشل ہونے پر سخت طیش آ رہا تھا۔ کھانے کے وقت وہ تنہا نظر آیا تو وہ اس کے پاس پہنچی۔ ”اب اتنی دیر سے کیوں آئے؟“

”بتایا تو تھا تمہیں بی بی نے‘ میرا فون آ گیا تھا۔“ وہ اس کے غصے کے جواب میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”ایک تو اتنی دیر سے آئے ہیں اور مجھ سے بالکل بھی بات نہیں کی ہے۔ یہاں تک کہ میری تعریف بھی نہیں کی ہے۔“

”تعریف کس بات کی؟ جہاں تک میرا خیال ہے یہ کھانا تم نے نہیں پکایا۔“ وہ مسکراہٹ اپنے لبوں پر قید کرتے ہوئے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”آج سب نے میری تعریف کی ہے سوائے آپ کے۔“ وہ اس کی بات نظر انداز کر کے اسی روٹھے لہجے میں بولی۔

”یہ پہلی مرتبہ پتا چلا کہ تعریف اس طرح زبردستی خود اپنے منہ سے کہہ کر بھی کروائی جاتی ہے۔“ وہ نگاہوں میں محفوظ سی مسکراہٹ لیے اسے چھیڑنے لگا۔

”اتنے سارے تعریفی جملے تو تم سن چکی ہوگی۔ میرے بولنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں ہے۔ اچھی لگ رہی ہو‘ پیاری لگ رہی ہو‘ بہت خوب صورت لگ رہی ہو اور اسی نوعیت کے دیگر ڈھیر سارے جملے۔ میں تو اتنی دیر سے یہی دیکھ رہا ہوں کہ مس ایمن مرکز نگاہ بنی ہوئی ہیں۔“ وہ جواب میں کچھ بھی نہیں بولی تو اس نے قدرے سنجیدگی اختیار کر کے کہا۔ وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ دوسروں کی تعریف اور اس کی تعریف اس کے لیے ایک جیسی نہیں ہے۔ وہ کوئی ایسا جملہ بھی کہتا جو پہلے وہ سن چکی ہوتی‘ تب بھی اس کے منہ سے سن کر وہ بالکل نیا اور بے حد خوبصورت لگتا۔

”آپ نے یہ دیکھا؟“ اس نے اپنا بریسلٹ والا ہاتھ اسے دکھایا۔

”بالکل دیکھ چکا ہوں اور مسلسل یہ بات سوچ رہا ہوں کہ جب میں نے اسے خریدا تھا تو اس وقت تو یہ اتنا

خوبصورت نہیں لگا تھا جتنا آج لگ رہا ہے۔“ وہ اپنے جملے کے اختتام پر خود ہی قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ”بس
ہو کر دی میں نے تمہاری تعریف۔ اب اس محفل میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس نے تمہاری تعریف نہ
وہ اس کے مذاق کو انجوائے کرتے ہوئے خود بھی ہنس پڑی۔

وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی چوڑیاں اتارنے میں مصروف تھی کہ توفیق کمال پہلی مرتبہ اس کے کمر
چلے آئے۔ اور انہیں اپنے کمرے میں دیکھ کر اس کی ایسی حالت ہوئی تھی جیسے کسی غریب کی کٹیا میں کسی
بادشاہ آ جائے۔

”پاپا آپ....؟“ بوکھلائے ہوئے انداز میں وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ان سے کیا کہے۔ ان کے
بہت ہلکی سی مسکراہٹ بھی تھی۔

”یہ تمہارا گفٹ ہے۔“ انہوں نے ایک خوبصورت سی کی چین میں لگی گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھ

”تمہاری گاڑی شام سے ہی پورچ میں کھڑی ہے۔ شاید تم نے نوٹ نہیں کیا۔“ وہ اس کی حیرت کے
میں اسی مسکراہٹ سمیت گویا ہوئے۔

”تھینک یو پاپا۔“ اس نے چابی ان کے ہاتھ سے لے لی۔

”مجھے تم سے بہت ساری امیدیں ہیں۔ اب MBA بھی اسی شاندار طریقے سے کرنا جیسے ایم
ہے۔ میں نے جب IBA سے MBA کیا تھا تو میری فرسٹ پوزیشن آئی تھی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ
بیٹی بھی اس تاریخ کو دہرائے۔“ وہ جواباً پرعزم انداز میں مسکرا دی۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑے پھر جیسے
اچانک ہی کوئی بات یاد آ گئی۔ ”تم آج بہت اچھی لگ رہی تھیں۔“ ان کے منہ سے نکلی یہ تعریف اسے بے
کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ حیرت سے آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔ پہلی مرتبہ ایک عجب سی
خواہش اس کے دل میں مچلی تھی۔ ان کے گلے لگ جانے کی خواہش۔ ان کے سینے پر سر رکھ کر رو
خواہش۔

مجھے اتنے عرصے تک کیوں بھولے رہے؟۔ یہ شکوہ کرنے کی خواہش۔ مگر وہ اپنی اس بچکانہ خواہش
نہیں کر سکتی تھی۔

وہ کتنا بھی خود سے جھوٹ بولتی کہ اسے توفیق کمال سے محبت نہیں۔ مگر اس سچ کو اس لمحہ جھٹلا نہیں پا رہی
اس کے لیے توفیق کمال بہت اہم ہیں۔

وہ جس طرح اپنی ماں کے ابنارمل رویوں کے باوجود ان سے محبت کرتی تھی‘ اسی طرح باپ کے غیر
اور خشک انداز کے باوجود ان سے بھی محبت کرتی تھی۔

انہیں اپنے کمرے تک لانے میں اسے ڈھائی سال لگے تھے اور یہ وہ جانتی تھی کہ صرف ڈھائی سال
ڈھائی سو سالوں تک بھی ان کی آمد کی منتظر رہتی۔ وہ تب بھی اس کے پاس نہ آتے‘ اگر حیدر مسعود اس کی
میں نہ آیا ہوتا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے قدم قدم چلنا سکھاتا ہوا اس مقام تک لے کر آیا تھا کہ وہ اپنے باپ

برابر میں کھڑی ہو سکے، ورنہ وہ تو آج بھی وہی ام ایمن ہوتی جو لوگوں سے بات نہیں کر سکتی تھی جسے خود پر
صلاحیتوں پر ذرا بھی بھروسہ نہیں تھا۔

وہ اس شخص کو کیا نام دے۔ اپنا دوست، اپنا محسن، اپنا سچا خیر خواہ یا وہ شخص جس سے وہ محبت کرتی ہے۔ وہ ا
کے لیے سب کچھ تھا۔

* * *

شام میں وہ نہا کر گیلے بال سکھانے اور ٹھنڈی ہوا میں کچھ دیر کھڑے ہونے کے لیے ٹیرس پر آ گئی۔ لان
نگاہ پڑی تو وہاں لان چیئرز پر توفیق کمال اور الماس کے ساتھ حیدر بیٹھا نظر آیا۔ اسے پتا تھا کہ ان کے درمیا
ہونے والی گفتگو بزنس سے ہی متعلق ہو گی۔ وہ اب پورے اعتماد کے ساتھ ان کی کاروباری گفتگو میں بھی شری
ہو سکتی تھی، اس لیے اس نے لان میں جانے کا فیصلہ کیا۔

"کتنے تمغے جمع کیے کل؟" اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد اس نے مسکرا کر پوچھا۔

وہ ہنستے ہوئے ان لوگوں کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

رشیدہ نے سب کے آگے چائے کے کپ رکھ دیے تھے۔

"ایمن کے لیے دو جگہوں سے پرپوزلز آئے ہیں۔" چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہوئے انہوں نے حید
بتایا۔ بزنس کے بارے میں باتیں کرتے کرتے انہوں نے یک دم ہی موضوع تبدیل کر دیا تھا۔ الماس
چہرے پر ایسی حیرت نظر آ رہی تھی جیسے وہ اس بات سے لاعلم تھیں۔

"اچھا، کہاں سے؟" سینڈوچ کھاتے ہوئے اس نے مطمئن سے انداز میں پوچھا۔

"کل پارٹی ہی میں پسند کیا ہے انہوں نے ایمن کو۔ آج صبح دس بجے جاوید غیاث کا فون آیا تھا۔ شہیر
لیے وہ ایمن کے رشتے کی بات کر رہے تھے پھر ابھی تھوڑی دیر پہلے ارسلان خان کا فون آیا، وہ بھی اپنے
کے لیے ایمن کا رشتہ چاہ رہے ہیں۔" توفیق کمال نے سنجیدگی سے حیدر کی طرف دیکھتے ہوئے اسے جواب د

"میرا اندازہ بھی یہی تھا۔ ویسے جیسی یہ کل لگ رہی تھی، اس حساب سے دو رشتے بہت کم ہیں۔ میرا خیا
کم از کم آٹھ دس رشتے تو ضرور آئیں گے۔" وہ ایک شوخ سی نگاہ ایمن پر ڈال کر ہنسا۔ توفیق کمال جواباً
دیے، جبکہ الماس مسکراتے ہوئے بولیں۔

"تمہارا اندازہ اتنا غلط بھی نہیں ہے۔ مجھ سے بھی رات پارٹی میں کافی لوگوں نے ایمن کے بارے
پوچھا تھا۔ رشتے کی بات تو خیر مجھ سے کسی نے نہیں کی مگر ڈھکے چھپے لفظوں میں یہ ضرور پوچھا کہ ایمن کی کہیں
یا بات تو طے نہیں ہو گئی۔"

"پھر توفیق بھائی! آپ مزید پرپوزلز کے لیے تیار رہیے۔ میرا خیال ہے سارے رشتے منظر عا
آ جائیں پھر اس بارے میں غور و فکر کیجیے گا۔" وہ توفیق کمال کی دی ہوئی اطلاع پر سکتے میں نہیں آئی تھی،
مسعود کی خوشی اور اطمینان کو دیکھ کر سکتے میں آئی تھی وہ اس بات پر اتنا خوش کس طرح ہو سکتا تھا۔

"فی الحال جو دونوں پرپوزلز آئے ہیں ان کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" توفیق کمال نے
سنجیدگی سے حیدر سے دریافت کیا۔

"ویسے تو اس معاملے میں ایما کی رائے اور اس کی مرضی کی اہمیت سب سے زیادہ ہے پھر
سے پوچھ رہے ہیں تو میرا خیال ہے شہیر جاوید کا رشتہ ایما کے لیے بہترین ہے۔ ارسلان کا بیٹا
ہر وقت دو اور دو چار کرنے والا۔ جبکہ شہیر ایسا نہیں ہے۔ بزنس میں ہونے کے باوجود بہ
ذہنیت نہیں رکھتا۔ ایما کسی خشک مزاج بزنس مین کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔

پچھلے سال جب میں لندن گیا، تب وہ وہیں پر تھا وہاں دو تین جگہوں پر میری اس سے
کافی دیر تک میری اس سے گفتگو ہوئی تھی اور اس گفتگو نے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔ اس کی سو
ویسے جاوید صاحب کے گھر کے ماحول کے بارے میں تو میں زیادہ اچھی طرح نہیں جانتا۔ آپ
دوستی ہے، اس بارے میں آپ کو زیادہ بہتر معلوم ہوگا۔ میں تو انہیں صرف بزنس ہی کے حوا
لیکن اگر صرف شہیر کے بارے میں، میں بات کروں تو وہ لڑکا مجھے بہت پسند ہے۔ میں یہ سمجھتا
کی عمر میں تین چار سال سے زیادہ فرق نہیں ہونا چاہیے۔ دونوں ہم عمر ہوں تو آپس میں انڈر
سے ہو جاتی ہے۔ ایک ہی ایج گروپ میں ہونے کی وجہ سے دونوں کی سوچ اور زندگی کے با
کسی حد تک ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔" حیدر نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ ان کے سوال کا تفصیلی

"مجھے بھی جاوید کی فیملی بہت پسند ہے۔ شہیر کے بارے میں میری بھی یہی رائے ہے
توفیق کمال نے اسے جواب دیا۔

"آپ ایسا کریں نا توفیق بھائی! کہ جاوید صاحب کی فیملی کو کسی دن ڈنر پر انوائٹ کر لی
لے، سمجھ لے اور سب سے بڑی بات کہ پسند کر لے پھر ہی آگے کے بارے میں سوچیے گا۔" و
ہوا ایک پل کے لیے اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ حیدر مسعود کی مسکراہٹ جو اسے بے حد پسند تھ
ناقابل برداشت لگنے لگی۔ وہ اتنا خوش کس طرح ہو سکتا ہے۔ کیا اسے اس خبر نے ذرا سی بھی ت
ایمن کی زندگی میں ایک دوسرا مرد آنے والا ہے۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم! ہم دونوں اسلام آباد ہو آئیں پھر کسی دن میں جاوید کو اس کی فیمل
انوائٹ کر لوں گا۔" وہ لوگ اب دوبارہ بزنس کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ اس نے اپ
والی چائے کو ایک گھونٹ میں ختم کیا۔ سینڈوچ کو بے دلی سے حلق سے نیچے اتارا اور پھر اپنا
وہاں سے اٹھ گئی۔

وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ رو رہی تھی، وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ صرف یہ سوچ کر ہی اسے
محسوس ہو رہی تھیں کہ اس کی زندگی میں حیدر مسعود کے علاوہ دوسرا کوئی شخص بھی آ سکتا ہے۔ وہ
کے لیے بھی باہر نہیں گئی، وہ ساری رات جاگتی اور بہت کچھ سوچتی رہی تھی۔

* * *

توفیق کمال کو اگلے روز دوپہر کی فلائٹ سے اسلام آباد چلے جانا تھا۔ وہ ان کے جانے سے
معیت سے پیچھا چھڑا لینا چاہتی تھی۔ صبح وہ ان کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ آفس جانے کے

تھے۔ صبح صبح اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر چونکے تھے۔

’’پاپا! میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میرا مطلب ہے جب تک میں ایم بی اے نہ کرلوں اس وقت تک۔‘‘ سلام کے فوراً بعد اس نے پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات ان سے کہی۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ انہوں نے حیرت یا ناگواری کا اظہار نہیں کیا تھا۔

’’ویسے ابھی اگر میں تمہاری انگیج منٹ کردوں اور شادی ایم بی اے کے بعد تو؟‘‘

’’نہیں، انگیج منٹ بھی نہیں۔ ابھی میں اس طرح کے کسی جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتی۔ مجھے پڑھنا ہے پھر آفس میں بہت کچھ سیکھنا ہے۔ شادی وغیرہ کے بارے میں دو تین سال بعد بھی تو سوچا جاسکتا ہے۔‘‘ وہ جتنے اعتماد سے ان کے ساتھ بات کر رہی تھی اس پر خود اسے بھی حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے انکار پر ان کے تاثرات بالکل نارمل تھے۔

’’مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ دو تین سالوں بعد جب تم شادی کے بارے میں سوچنے لگو تو مجھے بتا دینا اور اگر تمہاری کوئی پسند ہو تو وہ بھی بے خوف و بے جھجک مجھے بتا دینا۔ تمہاری شادی تمہاری پسند سے کرنے پر مجھے قطعاً کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔‘‘ ان کے جواب نے اس کی ایک مشکل تو آسان کردی تھی مگر جہاں اس کی مرضی ہے وہاں اس کی شادی ہوگی کیسے۔ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

حیدر مسعود اور توفیق کمال کی اسلام آباد سے واپسی ایک ساتھ ہوئی تھی۔ وہ دونوں ایئرپورٹ سے سیدھے آفس ہی آگئے تھے۔ لنچ سے کچھ پہلے توفیق کمال نے اسے اپنے پاس بلایا۔ الماس بھی وہیں تھیں۔ وہ اسے کل آفس میں ہونے والی ایک اہم میٹنگ سے متعلق چند اہم نکات سمجھانا چاہتے تھے۔ وہ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھی بغور ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اسی دوران ملازم نے کھانا لگا دیا تو وہ تینوں کھانے کے لیے آکر صوفوں پر بیٹھ گئے۔

’’فلائٹ ٹائم پر تھی؟‘‘ الماس کے استفسار پر وہ سنجیدگی سے بولے۔

’’ہاں، فلائٹ ٹائم پر تھی۔ نو بجے ہم لوگ کراچی پہنچ گئے تھے۔‘‘ ایمن نے اپنی پلیٹ میں فرائیڈ فش اور بیک ہوئے آلو ڈال لیے۔

’’حیدر، فاطمہ کے ساتھ شادی کر رہا ہے۔‘‘ وہ یہ خبر الماس کو سنا رہے تھے مگر الماس کے کسی حیرت بھرے استفسار سے پہلے توفیق کمال اور الماس دونوں کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹ کر میز پر گری تھی۔

’’آئم سوری۔‘‘ وہ بہت بری طرح شرمندہ ہوئی۔

’’کوئی بات نہیں۔‘‘ الماس اس کی شرمندگی دور کرنے کے لیے فوراً بولیں۔

وہ اپنی اس بے اختیارانہ حرکت کے بعد اب کھانا کھائے بغیر یہاں سے ہرگز نہیں اٹھنا چاہتی تھی اسی لیے توفیق کمال کے دوسری پلیٹ اس کے ہاتھ میں پکڑانے پر اس نے فوراً پلیٹ لے لی تھی اور تھوڑے سے چاول بھی اپنی پلیٹ میں ڈال لیے تھے۔

’’آپ حیدر کی فاطمہ سے شادی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔‘‘ الماس نے کچھ د
جانے والی بات کو دوبارہ شروع کیا۔ اسے پتا نہیں کیوں ایسا لگا جیسے الماس نے یہ ذکر جان بو
ہے۔ وہ پلیٹ پر نظریں مرکوز رکھنے کے باوجود یہ محسوس کر رہی تھی کہ الماس کن انکھیوں سے اسے
اپنے چہرے کے تاثرات کو ہر ممکن حد تک نارمل رکھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اسے یہ بھی پتا تھا ک
میں مکمل طور پر ناکام ہو رہی ہے۔

’’یہ بالکل اچانک کیسے حیدر نے فاطمہ سے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ کبھی ذکر تک نہیں کیا اس
کا۔ میں تو یہ سمجھتی تھی کہ فاطمہ بس حیدر کی ایک قریبی دوست ہے۔‘‘

’’مجھ سے آج صبح پلین میں حیدر نے یہ بات ڈسکس کی کہ وہ فاطمہ سے عنقریب شادی کر
رہا تھا کہ جب بجیلہ سے اس کی علیحدگی ہوئی تھی تو فاطمہ نے خود اس سے شادی کی خواہش کا ا
وقت چونکہ وہ شادی کے لیے سنجیدہ نہیں تھا اس لیے اس نے فاطمہ کو منع کردیا تھا مگر اب وہ اپن
بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہے۔

بی بی کے لیے بھی بات بہت خوشی کی ہے کہ حیدر شادی کے لیے مان گیا ہے۔ بتا رہا تھا ک
باقاعدہ فاطمہ کو پرپوز کر کے شادی کی تاریخ طے کرلے گا۔

ماریہ اور مکرم بچوں کے ساتھ اگلے مہینے پاکستان آرہے ہیں۔ میرا خیال ہے ان ہی دنو
رکھے گا حیدر۔‘‘ انہوں نے الماس کو بڑا مفصل جواب دیا تھا۔ وہ اپنی پلیٹ میں موجود چاول ختم کر

’’میں جاؤں پاپا!‘‘ انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر بغیر کچھ کہے انہوں نے سر ا
اور دوبارہ الماس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ وہ ان کے آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کے تیز
قدموں کا رخ حیدر مسعود کے آفس کی طرف تھا۔

’’آؤ ایما!‘‘ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا پھر اسے دیکھ کر اس کے لبو
مقدمی مسکراہٹ آگئی۔

’’بیٹھو۔‘‘ کی بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

’’لنچ کرلیا تم نے؟‘‘ اس نے ابھی بھی سر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا۔

’’آپ فاطمہ کے ساتھ شادی کر رہے ہیں؟‘‘ اس کے سوال میں غصہ زیادہ تھا یا صدمہ ا
تھا۔ وہ کی بورڈ اور مانیٹر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھ

’’تم مجھے مبارک باد دینے آئی ہو یا ناراض ہونے؟‘‘ اس کی یہ آخری آس بھی دم توڑ گئی
جھوٹی ہو۔ وہ مسکراتا ہوا اتنا خوش نظر آرہا تھا جیسے شادی کا یہ فیصلہ اس کے لیے بہت خوشی اور اطمینا

’’تمہارے تاثرات تو یہ بتا رہے ہیں کہ تم ناراض ہونے آئی ہو۔ ویسے تمہاری ناراضی صحیح ب
بات سب سے پہلے تمہیں بتانی چاہیے تھی۔ بس باتوں باتوں میں توفیق بھائی سے میں ذکر کر بیٹھ
ہوئے اس کی ناراضی اور شکایت دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

’’آپ فاطمہ سے شادی کس طرح کر سکتے ہیں؟‘‘ غصے سے اس کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔

’’کیوں نہیں کر سکتا بھئی! اتنی اچھی لڑکی ہے وہ۔ میں اسے اتنے سالوں سے جانتا ہوں۔ تم بھی تو اس سے مل چکی ہو۔ تم بتاؤ' کیا وہ میرے لیے مناسب ترین لڑکی نہیں ہے۔ وہ اعلا تعلیم یافتہ ہے' مہذب ہے' مسلمان ہے' میری اور اس کی سوچ میں بہت ہم آہنگی ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ بی بی کتنے عرصے سے شادی کرنے کے لیے کہہ رہی تھیں اور میں انہیں ٹال رہا تھا۔ اب میں انہیں مزید ناراض نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی اس عمر میں اب مجھے شادی کر ہی لینی چاہیے۔ آخر بزنس کے جھمیلوں کی وجہ سے اور کتنا اپنی زندگی کے اس اہم ترین معاملے کو ٹالوں گا۔‘‘ اس نے اس بار بڑی سنجیدگی اور متانت سے اسے جواب دیا تھا۔

’’یہ ساری خوبیاں تو مجھ میں بھی ہیں۔ میں بھی اعلا تعلیم یافتہ ہوں' مہذب ہوں' مسلمان ہوں' آپ کے مزاج کو سمجھتی ہوں۔‘‘ وہ مشتعل انداز میں بولتے بولتے حیدر کے درمیان میں ٹوک دینے کی وجہ سے چپ ہو گئی تھی۔ ’’کیا بدتمیزی ہے یہ ایما!‘‘ وہ بہت ناراضی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ کی جگہ ناراضی اور ناپسندیدگی نے لے لی تھی۔

’’میں کوئی بدتمیزی نہیں کر رہی ہوں۔ اچانک ہی آپ کو شادی کر لینے کا خیال کیسے آ گیا۔ پرسوں پاپا کے ساتھ بیٹھ کر شہیر جاوید کی خوبیاں گنوا رہے تھے اور آج فاطمہ کے قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ جب آپ کو یہ پتا ہے کہ میں کیسے آدمی کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں تو کیا آپ کو یہ نہیں پتا کہ ایسا صرف ایک ہی آدمی ہے اور وہ آپ ہیں۔‘‘ اس کی ناراضی نے ایمن کے غصے میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔

’’بہت فضول اور غلط بات کر رہی ہو تم ایما! تمہیں پتا ہے تم مجھ سے کتنی چھوٹی ہو۔ تمہیں کسی اور انداز سے دیکھنے کا تو میں کبھی تصور تک نہیں کر سکتا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ بے ہودہ خیال تمہارے ذہن میں آیا کیسے؟‘‘

’’آپ کو محبت کرنا بے ہودگی لگتا ہوگا' مجھے نہیں۔ مجھے پتا ہے' آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ صرف بجیلہ کی اس روز کی باتوں کی وجہ سے آپ اپنی محبت سے منکر ہو گئے ہیں۔ اسی نے یہ ’’عمر میں کتنی چھوٹی‘‘ والی بات آپ کے ذہن میں ڈالی تھی۔‘‘ وہ بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

’’دماغ خراب ہو گیا تھا بجیلہ کا اور دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ میرے کس انداز سے تم نے یہ اندازہ لگایا کہ میں تمہارے لیے اسی طرح سوچتا ہوں۔ کبھی میں تم سے چھپ کر اکیلے میں نہیں ملا' کبھی میں نے تم سے کوئی ایسی بات نہیں کی' تمہیں سب سے چھپا کر فون کالز نہیں کیں' تمہارے ساتھ کہیں گیا یا تم سے ملا تو علی الاعلان۔ جس لہجے میں' میں تم سے اکیلے میں بات کرتا ہوں' اسی میں توفیق بھائی' الماس آپی اور بی بی کے سامنے بھی بات کرتا ہوں۔ تم میرے لیے ہمیشہ میری بہت چھوٹی اور پیاری سی دوست رہی ہو۔ بجیلہ کی گندی ذہنیت کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ اگر اس کی باتوں نے تمہیں اس سوچ میں مبتلا کیا تھا تو پلیز اس سوچ کو اپنے ذہن سے نکال دو۔‘‘ اس کا لہجہ بہت زیادہ ناراضی اور خفگی کا اظہار کر رہا تھا۔

’’آج کے بعد یہ فضول بات تم میرے ساتھ مت کرنا ایما! تم ابھی بہت چھوٹی اور معصوم ہو۔ پتا نہیں
اس قسم کی فضول اور غلط بات تمہارے ذہن میں آئی۔ بہرحال جو بھی ہے' اس بات کو یہیں پر ختم کر دو۔ ذر
اگر توفیق بھائی کو ایسی کسی بات کے بارے میں کچھ علم ہوا تو انہیں کتنا افسوس ہوگا' تم پر بھی اور مجھ پر بھی۔
سوچیں گے کہ میں ان کی بیٹی سے دوستی کی آڑ میں افیئر چلا رہا تھا۔‘‘ وہ اسے یہ بتا رہا تھا کہ وہ اس
کر کے ایک بہت بڑے گناہ کی مرتکب ہوئی ہے اور اپنے اس گناہ کو اسے سب سے چھپا لینا چاہیے۔ اس
اشتعال' صدمہ اور رنج میں بدلتا جا رہا تھا۔

وہ اس کی محبت کو حماقت اور بے وقوفی قرار دے کر اسے اس حماقت سے باز رکھنے کی بھی کوشش کر رہا
کس بات کا یقین کرے' وہ بات جو پچھلے ڈھائی سالوں سے اس کا دل اسے سمجھا رہا تھا اس کا یا وہ جو
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ بول رہا تھا۔

’’تم یہاں پر بیٹھو' ہم آرام سے بیٹھ کر اس موضوع پر بات کرتے ہیں۔‘‘ اس کے چہرے پر نجانے کس
کے تاثرات ابھر رہے تھے جنہوں نے حیدر کو اپنا لہجہ نرم اور شیریں کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ دوستانہ اور پر
نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بیٹھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

’’تمہیں تمہاری عمر کا کوئی لڑکا نہیں مل رہا تھا جو اس کے پیچھے پڑی ہو' بجیلہ کی آواز ایک دم اس کی
میں گونجی تھی۔ کیا واقعی وہی اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے؟ کیا اس کی حیدر مسعود سے محبت یک طرفہ ہے؟ ا
بجیلہ کی باتوں کو کبھی اہمیت نہیں دی تھی مگر اس وقت اسے بجیلہ کا حقارت بھرے انداز میں کہا گیا یہ جملہ
طرح چبھا تھا۔

’’پلیز بیٹھو ایما!‘‘ اس نے بڑی نرمی سے ایک مرتبہ پھر اس سے بیٹھنے کے لیے کہا۔

’’میں آپ کی زندگی میں کس جگہ پر ہوں حیدر مسعود؟‘‘ وہ آج سارے سچ سن لینا چاہتی تھی۔

’’کیا ہو گیا ہے تمہیں ایما! یہ کس طرح کے بے وقوفانہ سوالات کر رہی ہو۔ کیا تمہیں نہیں پتا کہ تم میرے
کتنی اہم ہو۔ تم میری اتنی پیاری دوست ہو۔‘‘

’’آپ بات کو گھما پھرا کر جواب مت دیں۔ آپ کو پتا ہے' میں آپ سے کیا پوچھ رہی ہوں۔ یہ ’’
دوست‘‘ اور ’’اہم ہو‘‘ والی باتوں سے میں مطمئن نہیں ہو سکتی۔ آپ سیدھا اور صاف جواب دیں مجھے۔ آ
سے شادی کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟‘‘ وہ اس کی بات کاٹ کر دو ٹوک انداز میں بولی۔

’’ایما! تمہیں کیا......‘‘

’’کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟‘‘ اس نے انگلی اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکتے ہوئے بے لچک اند
پوچھا۔ حیدر نے تھک کر ایک گہری سانس لی تھی۔

’’نہیں۔‘‘ کمرے کی چھت اسے اپنے سر پر آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی مگر وہ اس کے ملبے تلے دبنے س
اس سے ایک آخری سوال پوچھنا چاہتی تھی اور وہ آخری سوال اس کے لیے اس کی زندگی سے بھی زیادہ اہم تھ

''آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟''

''میں تم سے محبت کرتا ہوں ایما! مگر اس طرح سے نہیں جیسے......''

''کرتے ہیں یا نہیں؟'' وہ چھت کو اپنے سر سے چند انچوں کے فاصلے پر دیکھ رہی تھی۔

''نہیں۔'' اور چھت اس کے سر پر آ کر گر چکی تھی۔ وہ بے یقینی اور حیرت سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ اندھا دھند کمرے سے باہر نکلی تھی۔ ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ وہ اپنے کیبن میں گاڑی کی چابی اور اپنا بیگ اٹھانے گئی تھی۔ وہ لفٹ کی طرف تیز قدموں سے جا رہی تھی جب اسے اپنے پیچھے کوریڈور میں ایک آواز سنائی دی۔

''ایما!'' وہ اس آواز کو زندگی میں دوبارہ کبھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے جنونی انداز میں لفٹ کا بٹن دبا دیا تھا۔ ''تم اس طرح سے کہاں جا رہی ہو؟ سکون سے بیٹھ کر ساری بات سمجھنے کی......'' لفٹ کا انتظار ترک کر کے وہ سیڑھیوں کی طرف بھاگی تھی۔ اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اسے اس طرح بھاگتے دیکھ کر لوگ کیا سوچیں گے۔ وہ اس جگہ سے جلد سے جلد دور چلی جانا چاہتی تھی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ وہ اس کی طرح بھاگ نہیں رہا تھا اس لیے وہ اس سے خاصا پیچھے تھا۔

''مس ام ایمن! جو لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں' میں ان سے دوستی کر لیتا ہوں' ان کی پروا کرتا ہوں' ان کا خیال رکھتا ہوں' ان کی فکر کرتا ہوں۔'' وہ پیچھے سیڑھیوں پر سے اترتا ہوا اس سے کیا کہہ رہا تھا' اسے سنائی نہیں دے رہا تھا۔

''ایما! پلیز تم رک کر میری بات سنو۔''

''تمہاری آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں' تمہاری ہنسی کتنی پیاری ہے۔'' وہ سیڑھیاں اتر کر ریسپشن لابی میں آ چکی تھی۔

''جب تمہاری ہنسی اتنی خوب صورت ہے پھر تم ہنسنے میں اتنی کنجوسی کیوں کرتی ہو۔'' وہ پارکنگ میں آ گئی تھی۔

''ابھی تمہیں خود نہیں پتا لیکن میں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ اگر کوئی تمہیں صحیح سمت میں چلنا سکھا دے تو تم کہاں پہنچو گی۔'' اس کے خود تک پہنچنے سے پہلے اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

اس نے گاڑی اپنے گھر کے گیٹ کے باہر ہی روک دی۔ چوکیدار کے گیٹ کھول دینے کے باوجود وہ گاڑی اندر نہیں لائی تھی۔ اس کے گیٹ سے اندر گھستے ہی ایک دوسری گاڑی بھی گیٹ پر آ کر رکی تھی۔

''ایما! رکو۔'' وہ دور سے چلایا تھا۔

''میں بھی بہت خوش ہوں ایما! تم اپنے چہرے کے ان خوشی بھرے تاثرات کو سنبھال کر رکھو۔ تمہاری روتی بسورتی شکل سب سے زیادہ میں نے ہی دیکھی ہے۔ تو اب ہنستی اور خوش ہوتی ایما کو بھی سب سے پہلے میں ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اسے ہنستی اور خوش ہوتی ہوئی ایما پسند تھی تو وہ اسے روتی ہوئی ایما کی شکل دکھانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔ اسے پیچھے پورچ سے اس کی آواز سنائی دی۔ وہ اندھا دھند سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے کا دروازہ لاک کر کے وہ کارپٹ پر گر گئی تھی۔ آج ام ا
کے لیے زندگی میں سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ بالکل اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ اسے اکیلے
رہ جانے کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اس بات پر نہیں رو رہی تھی کہ وہ حیدر مسعود کے سامنے اپنی انا اور اپنی عزت نفس
گنوا کر آئی ہے بلکہ اس بات پر رو رہی تھی کہ اپنی زندگی میں موجود جس واحد شخص سے وہ یہ امید رکھتی تھی ک
اسے کبھی کوئی دکھ نہیں دے گا' آج اس نے اسے دکھ دے دیا تھا۔

دوسروں کے دیے ہوئے دکھوں پر وہ اس کے پاس بیٹھ کر آنسو بہاتی تھی۔ آج جب اس نے دکھ دیا تھا
کس کے پاس جاتی۔ اس کی زندگی میں تو وہی ایک شخص تھا اپنی خوشیاں شیئر کرنے کے لیے بھی اور دکھو
رونے کے لیے بھی۔ حیدر اس کے لیے سب کچھ تھا اس کی کل زندگی اور آج وہ اپنی زندگی گنوا آئی تھی۔

❀ ❀ ❀

وہ نہا کر کپڑے بدلنے کے بعد کمرے سے باہر آ گئی۔ الماس ڈائننگ روم سے نکل رہی تھیں۔ ان
کندھے پر موجود پرس اور ہاتھوں میں پکڑے موبائل فون اور سن گلاسز بتا رہے تھے کہ وہ آفس جا رہی ہی
اسے دیکھ کر وہ رک گئیں۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے ام ایمن!''

''ٹھیک ہوں۔'' وہ ڈائننگ روم میں آ گئی۔

''میں اور توفیق تو آفس سے ایک میٹنگ میں اور پھر وہاں سے ایک ڈنر میں چلے گئے تھے پھر کافی رات
ہماری واپسی ہوئی تھی مگر رشیدہ ابھی مجھے بتا رہی تھی کہ تم کل سارا دن اپنے کمرے میں رہی ہو اور تم نے را
کھانا بھی نہیں کھایا۔'' وہ اس کے پیچھے ڈائننگ روم میں آ گئی تھیں۔

''میرے سر میں درد تھا۔'' وہ ٹیبل پر بیٹھ گئی تھی۔

''میں آج آفس نہیں آ سکوں گی' آپ پاپا کو بتا دیجیے گا۔ آج میٹنگ میں انہوں نے مجھ سے شریک ہو
کے لیے کہا تھا۔'' وہ سلائس پر مکھن لگانے لگی۔ الماس بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کی نگاہوں کو نظر انداز کر
سلائس پر مکھن لگاتی رہی۔

''کیا بات ہوئی ہے ایمن! تم حیدر کی شادی کی بات سے ڈسٹرب ہو؟'' وہ اس کے برابر والی کرسی پر بیٹ
تھیں۔ ان کے لہجے میں اس کے لیے ہلکی سی تشویش موجود تھی۔ وہ جواباً چپ رہی۔

''تم نے حیدر سے اس بارے میں کیا کوئی بات کی ہے؟'' شاید ساتھ رہتے رہتے انہیں اس سے تھو
بہت ہمدردی ہو ہی گئی تھی۔

''صرف تم ہی کو اس خبر سے شاک نہیں پہنچا ایمن! ہمیں بھی شاک پہنچا ہے۔ خاص طور پر توفیق کو۔ ا
حیدر کس قدر پسند ہے تم جانتی ہو' وہ تمہاری اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے۔ حیدر نے کبھی ایسی کوئی بات

نے' کبھی ایسا کچھ نہیں کہا جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ تمہیں کسی اور حوالے سے پسند کرتا ہے مگر مجھے اور توفیق کو لگتا تھا کہ بات کچھ ایسی ہی ہے۔

وہ بہت گہرا اور بہت مشکل پسند ہے' اپنے جذبات کو چھپا کر رکھنے والا۔ تمہاری طرف سے تو ہمیں سو فیصد یقین تھا کہ تم اس سے محبت کرتی ہو مگر اس کی طرف سے بات شک و شبہے والی تھی۔ جس طرح اس نے تم سے دوستی کی تھی اور جس طرح وہ تمہارا خیال رکھتا تھا' ایسے وہ کبھی کسی کے ساتھ نہیں کرتا۔ اس کے باوجود توفیق جیسے ذہین آدمی بھی پورے یقین کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔ توفیق شش و پنج میں تھے۔ وہ حیدر کی طرف سے کسی واضح اظہار کے منتظر تھے مگر وہ کچھ دلچسپی ظاہر ہی نہیں کر رہا تھا۔ توفیق نے اس اتوار کو حیدر سے باتیں کرتے ہوئے جو اسے تمہارے پرپوزلز کے بارے میں بتایا تھا تو جان بوجھ کر بتایا تھا۔ وہ حیدر کا ردعمل جاننا چاہ رہے تھے مگر اس کا ردعمل تو اتنا خلاف توقع تھا کہ توفیق دنگ رہ گئے۔

حیدر کے جانے کے بعد وہ اس بارے میں مجھ سے کافی دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ حیدر کے ردعمل سے بہت مایوس ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم اس سے کتنی محبت کرتی ہو۔ تمہارے لیے یہ سب سہنا آسان نہیں ہے مگر پھر بھی میں تم سے یہی کہوں گی کہ خود کو سنبھالو۔“ الماس نے اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ چند سیکنڈز بغور اسے دیکھنے کے بعد وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد اس نے ایک سلائس کھا کر چائے کے دو کپ پیے' اس کے بعد وہ اٹھ کر لاؤنج میں آ گئی۔ لاؤنج میں آ کر بیٹھنے کے بجائے وہ ٹیلی فون پر ایک نمبر ڈائل کرنے لگی۔

”ہیلو سر جلیل سے بات ہو سکتی ہے؟“ دوسری طرف سے کال ریسیو کیے جانے کے بعد اس نے شائستگی سے کہا۔

”میں ان کی اسٹوڈنٹ ہوں ام ایمن!“ دو تین منٹ تک اسے انتظار کرنا پڑا تھا۔

”السلام علیکم سر!“ اس کے لہجے میں احترام بہت نمایاں تھا۔

”بالکل ٹھیک ہوں سر! آپ کیسے ہیں؟“

”جی سر رزلٹ آ گیا' فرسٹ پوزیشن آئی ہے میری۔“ ان کا سوال سننے کے بعد اس نے خوش دلی سے بتایا۔

”آخری سمسٹر میں آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی تھی سر! آپ کے آفس میں گھنٹوں بیٹھ کر بحث و مباحثہ کرنے کی عادت جو ہو گئی تھی ہم لوگوں کو۔“ وہ ہولے سے ہنس دی۔

* * *

”کیا بات ہے توفیق بھائی! آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔“ وہ آفس میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلے چار پانچ روز سے وہ اسے بہت الجھے ہوئے اور پریشان لگ رہے تھے۔ حیدر نے انہیں بزنس میں آنے والی مشکلات کی وجہ سے کبھی ٹینشن میں آتے اور الجھتے نہیں دیکھا تھا۔

کل رات وہ دونوں ایک بزنس ڈنر میں شریک تھے اور حیدر نے انہیں وہاں سارے وقت خاموش اور غائب دماغ محسوس کیا تھا۔ وہ کاروباری دوستوں سے اس طرح باتیں نہیں کر رہے تھے جیسے ان کی عادت تھی۔

اگلے ہفتے انہیں اور حیدر کو ایک بہت ہی اہم کنٹریکٹ پر سائن کرنے کے لیے زیورچ جانا تھا مگر اس وقت ان کی مسلسل خاموشی اور بے توجہی اسے الجھا گئی تھی۔ وہ اس کے سوال پر قصداً تھوڑا سا مسکرائے۔

”نہیں' کوئی پریشانی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے بہت ہفتوں سے مجھے مکمل ریسٹ نہیں مل پا رہا' شاید اس لیے تھک گیا ہوں۔“ حیدر نے گہری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ وہ پریشان تھے مگر اپنی پریشانی اس سے شیئر نہیں کر چاہتے تھے۔ وہ ان کے اس انداز کے بعد مزید اصرار نہیں کر سکتا تھا۔

”آپ ایک دو دن گھر پر آرام کر لیں۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ زیورچ ساری تھکن اتار کر جاؤں تو اچھا ہے۔“ انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے اس کے مشورے سے اتفاق کیا۔

”توفیق بھائی کس بات سے پریشان ہیں الماس آپی!“ وہ ان کے پاس سے گفتگو ختم ہونے کے بعد سید الماس کے پاس چلا آیا۔ وہ آنکھوں پر گلاسز لگائے کوئی فائل دیکھنے میں مصروف تھیں۔

”وہ ایمن کی وجہ سے پریشان ہیں۔“

”کیا ہوا ہے اسے؟“ اس کی دی ہوئی خبر نے اسے اندر ہی اندر ڈرا دیا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر کو خوف یا تشویش نہیں آنے دی تھی مگر اس کا دل ایک دم ہی تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

”وہ حیدر آباد واپس جا رہی ہے حیدر!“ ان کی اطلاع نے اس کے تیز تیز دھڑکتے ہوئے دل کو نارمل کیا اور جو کچھ بھی تھا' کم از کم وہ ٹھیک تو تھی۔ اس نے بے اختیار دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

”حیدر آباد......؟ مگر وہاں کون ہے' وہ کس کے پاس جا رہی ہے؟“ اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کیو جا رہی ہے حالانکہ اصولی طور پر سب سے پہلا سوال یہی ہونا چاہیے تھا کہ اس نے وہاں جانے کا فیصلہ کیوں ہے۔ الماس نے ایک پل کے لیے خاموشی سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر سوائے حیرت کے اور کوئی تا نہیں تھا۔ وہ اس خبر سے صرف حیران ہوا تھا۔

”یونیورسٹی میں اس کے کوئی پروفیسر تھے' ان کا تعلق حیدر آباد سے ہی تھا۔ سات آٹھ مہینے پہلے ان ریٹائرمنٹ ہوئی اور وہ واپس اپنے آبائی شہر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے غریب بچوں کو مفت تعلیم دینے کے ایک اسکول کھول لیا ہے۔ ایمن کی اپنے ان پروفیسر کے ساتھ کافی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ وہ وہاں ان کے اسکو میں جاب کرنے کے لیے جا رہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ غریب اور مستحق بچوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے۔ کسی اچھے مقصد کو ساتھ لے کر زندگی گزارنا چاہتی ہے۔“

”دماغ خراب ہو گیا ہے کیا اس کا' اگر اسے سوشل ورک کا اتنا شوق ہے تو یہاں پر رہ کر بھی بہت کچھ کر ہے۔ توفیق بھائی کو اسے روکنا چاہیے۔ وہ اس کے باپ ہیں' اس کی من مانی پر پریشان ہونے کے بجائے ان

اسے سختی سے روکنا چاہیے۔" وہ ان کی بات سن کر بہت جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔

"وہ اسے سختی سے، پیار سے کسی نہ کسی طرح روک لیتے حیدر! اگر وہ انہیں ایسا کوئی حق دیتی تو۔" وہ سنجیدگی سے بولیں۔

"اس نے ان سے مشورہ نہیں لیا، اجازت طلب نہیں کی۔ اس نے انہیں اطلاع دی ہے۔" وہ خاموشی الماس کی بات سن رہا تھا۔

"جب اس کی اپنے پروفیسر سے بات ہوگئی، اس کی جاب پکی ہوگئی۔ حیدر آباد میں رہائش کا انتظام ہوگیا، تب اس نے کھانے کی میز پر توفیق کو یہ بتایا کہ وہ اگلے ہفتے حیدر آباد جا رہی ہے۔

توفیق نے آج کل اس سے بات چیت بالکل بند کر دی ہے اور اسے ان کے بات نہ کرنے سے بھی فرق نہیں پڑ رہا۔ اتنے سکون سے وہ اپنے جانے کی تیاری کر رہی ہے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اب تو اس جانے میں صرف دو دن رہ گئے ہیں۔ آج کل وہ اپنے دوستوں سے مل رہی ہے، اپنی شاپنگ کر رہی ہے۔ تو نے اس کی ذہانت اور صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اس سے کتنی ساری امیدیں وابستہ کر لی تھیں، مگر اب وہ ایک ہی سب کچھ چھوڑ کر جا رہی ہے۔ توفیق کے ناراض ہونے پر سکون سے کہہ رہی تھی کہ "میں آپ سے ملنے لیے کراچی آیا کروں گی، آپ کو پابندی سے فون بھی کروں گی اور اگر آپ کے پاس ٹائم ہو اور آپ منا سمجھیں تو مجھ سے ملنے کے لیے آ جایا کیجیے گا۔" وہ ایک گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ تھا۔

"مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں تھا ورنہ میں اسے سمجھاتا۔"

وہ اسی کی وجہ سے جا رہی ہے اور وہ یہ بات جانتا بھی ہے پھر بھی کتنے اطمینان سے اسے سمجھا لینے کا دعوا کر ہے۔ الماس نے حیدر مسعود کی طرف رشک سے دیکھا۔

الماس اس کے چہرے پر، اس کی آنکھوں میں کچھ بھی نہیں پڑھ رہی تھیں۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ شاید وہ بیمار ہے۔ اسی لیے آفس نہیں آ رہی۔" وہ پیپر ویٹ کو گھماتے ہوئے بولا۔

"آپ مجھے کافی نہیں پلوائیں گی؟" اس نے خود ہی موضوع تبدیل کر دیا۔

"کیوں نہیں، ضرور۔ خالی کافی پیو گے یا کچھ اور بھی منگواؤں۔" اس کے چہرے پر کچھ بھی کھوجنے میں ناکا ہو جانے پر انہوں نے ہار مان لی تھی۔

"نہیں صرف کافی، مگر ہوتی بہت مزیدار چاہیے۔" وہ مسکراتے ہوئے انٹرکام پر کافی کے لیے کہنے لگیں۔ ان کے ساتھ کافی پیتے ہوئے سائرہ کی پڑھائی کے بارے میں باتیں کرنے کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر بیٹھنے کے بعد اس کے چہرے پر سے مصنوعی اطمینان اور سکون کا ملمع اتر گیا تھا، ا اس کے چہرے پر پریشانی تھی، بے تحاشا پریشانی۔

"شائستہ تھوڑی دیر تک کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔" انٹرکام پر اپنی سیکرٹری کو یہ ہدایت دینے کے بعد وہ

دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

یہ زندگی کیا کر رہی تھی۔ خود کو اتنا بے اختیار اور بے بس اس نے زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

میرے پاس صرف ایک رشتہ ہے، صرف ایک، آپ سے دوستی کا۔ میرے پاس اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اس رشتے کو مجھ سے مت چھینیں۔" وہ رو رہی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"ایما......" اس نے گھبرا کر اپنا سر اوپر اٹھایا۔ "میں آپ کی زندگی میں کس جگہ پر ہوں حیدر مسعود؟" وہ اس کے بالکل سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟" وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کرتے ہیں یا نہیں؟"

"ہاں، کرتا ہوں۔ اول روز سے کرتا ہوں۔ بے حساب کرتا ہوں، اتنی شدید محبت جس کا تم تصور بھی نہی کر سکتیں۔" وہ زیر لب ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ اس نے اپنا سر میز پر گرا دیا تھا۔

کیوں ہو گئی تھی اسے اپنے سے اتنی چھوٹی لڑکی سے محبت، جس محبت کا وہ کسی کے سامنے اقرار تک نہیں کر سک تھا۔ محبت کیسی ہوتی ہے، یہ کتنی بے بس کر دینے والی ہوتی ہے، انسان پر سے اس کے سارے اختیار چھین لینے وال وہ اپنی زندگی کے چونتیس سالوں تک کبھی اس جذبہ کو جان ہی نہ سکا۔

کوئی مرد کسی عورت کو اسی وقت پسند کرتا ہے یا اس سے محبت کرتا ہے جب وہ اس کی معیار پر پورا اترتی اور کوئی عورت کسی مرد سے اسی وقت محبت کرنا شروع کرتی ہے جب وہ اس کے معیار کے مطابق ہوتا ہے۔ اس نے اپنے ارد گرد ایسی ہی محبتیں دیکھی تھیں۔ خود اس نے جمیلہ کو شادی کے لیے پسند کیا تھا تو اس کی تمام خوبیوں او اچھائیوں سے متاثر ہونے کے بعد وہ اسے محبت نہیں مانتا تھا اور جسے وہ محبت مانتا تھا وہ حقیقت میں کہیں نہی ہوتی، اس بات کا اسے سو فیصد یقین تھا مگر یہ یقین اس روز غلط ثابت ہو گیا جس روز وہ ام ایمن نام کی ایک ڈر سہمی اور گھبرائی ہوئی لڑکی سے حیدر آباد کے ایک پسماندہ محلے کے ایک چھوٹے سے مکان میں ملا۔ وہ وہاں دلی سے آیا تھا۔ صرف توفیق کمال کی خاطر۔

اپنی بے زاری توفیق کمال پر ظاہر کیے بغیر وہ اسے لینے چلا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ ایک چھوٹا سا واق اس کی پوری زندگی کو بدل کر رکھ دے گا۔ اس نے زندگی کے تینتیس سالوں تک کبھی محبت کو نہیں مانا تھا۔ کبھی اس جذبے پر ایمان نہیں لایا تھا۔

مگر زندگی کے چونتیسویں سال میں اپنے سے بارہ تیرہ سال چھوٹی، کم عمر اور ڈری سہمی سی لڑکی سے محبت میں مبتلا ہونے کے بعد اسے محبت کو ماننا پڑا۔ اس جذبہ پر ایمان لانا پڑا۔ وہ عام سی شکل و صورت کی معمولی سی لڑک اس کی محبت تو کیا دوستی کے قابل بھی نہیں تھی۔

وہ گاڑی میں اس کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بہت عام سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ چپکے چپکے ر رہی تھی اور اپنے آنسو اس سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیسی خواہش ابھری تھی ان لمحوں میں اس کے دل

میں۔ اس کے چہرے پر سے سارے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کر دینے کی خواہش، اپنی کیفیات اس کے لیے بہت حیران کن تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ جمیلہ کے زندگی سے نکل جانے کے بعد اس نے کسی دوسری لڑکی کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھا ہی نہ تھا۔

اس کی دولت اور اس کی مردانہ وجاہت میں ایسی کشش تھی کہ لڑکیاں خود بخود ہی اس کے پیچھے آتی تھیں۔ ان پیچھے آنے والیوں میں سے چند لڑکیوں کے ساتھ کچھ وقت ہنسی خوشی گزار لیا کرتا تھا جو اس کے معیار پر پوری اترتی تھیں۔ وہ وقت گزاری کے لیے بھی کسی عام سی لڑکی کا انتخاب نہیں کرتا تھا۔ اس لڑکی میں تو ایسا کچھ تھا ہی نہیں جو اسے چونکاتا، جو اسے متوجہ کرتا، جو اس لڑکی کو غیر معمولی اہمیت دینے پر مجبور کرتا، پھر بھی وہ اسے چونکا رہی تھی۔ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

اس رات کو وہ اسی کی وجہ سے مضطرب تھا۔ وہ اپنے کمرے میں کیا کر رہی ہوگی؟ وہ ٹیرس پر کھڑا تھا۔ اسے دروازے سے باہر نکلتے اور سوئمنگ پول کے پاس بیٹھتے دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔

اور اس نے اس کے ساتھ کتنی عجیب اور کتنی مختلف بات کی تھی اپنی ممی کے بارے میں۔ وہ ممی کے بارے میں اپنے قریبی دوستوں سے تو کیا پی بی اور ماریہ تک کے ساتھ کوئی بات نہیں کرتا تھا۔

مگر اس نے اس انجان لڑکی سے ممی کے بارے میں بات کی تھی، اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ اس وقت وہ اپنی ماں ہی کو یاد کر کے اتنی اداس ہے۔ وہ رونا چاہتی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس پر اعتبار کر کے اس کے سامنے رو لے۔ تنہا بیٹھ کر رونے سے کسی کے پاس بیٹھ کر رو لینا شاید اس کے غم کو کچھ کم کر دے۔ اس کی سوچ بالکل صحیح ثابت ہوئی تھی۔ اس نے ممی کے بارے میں اس سے بات کی تو وہ اس سے ڈرنا اور خوف زدہ ہونا چھوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے ممی کے بارے میں اور پھر اپنی امی کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ وہ جتنی کم عمر تھی اتنی ہی سادہ اور معصوم بھی تھی۔ اس سادہ اور معصوم سی لڑکی کے لیے اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ اسے توفیق کمال پر بے انتہا غصہ آ رہا تھا۔ کیا اپنی بیٹی کو غم کی اس مشکل گھڑی میں تنہا چھوڑ کر انہیں امریکہ چلے جانا زیب دیتا تھا۔ وہ توفیق کمال کو بہت پسند کرتا تھا۔ ان کی ذہانت، کاروباری سوجھ بوجھ وہ ان سب سے متاثر تھا مگر اس وقت اس لڑکی کے پاس بیٹھ کر اس نے توفیق کمال کو دنیا کا سب سے ظالم اور سفاک انسان سمجھا تھا۔

کیا یہ معصوم سی لڑکی اس سلوک کی حق دار تھی۔ کیا باپ کو بیٹی کے پاس خود نہیں جانا چاہیے تھا۔ کیا اسے بیٹی کی خاطر اپنا امریکہ جانا ملتوی نہیں کر دینا چاہیے تھا؟ وہ دیکھ رہا تھا کہ اسے ماں کے مرنے کے ساتھ ساتھ باپ کے ظالمانہ رویے پر بھی دکھ ہے۔ وہ لڑکی اسے کتنی مظلوم، کتنی تنہا اور کتنی اداس لگ رہی تھی۔

وہ اس کے دل سے اس دکھ کو دور کرنا چاہتا تھا کہ اس کا باپ اسے لینے کے لیے خود نہیں گیا۔ اس نے اس کی خاطر اپنا جانا ملتوی نہیں کیا۔ اسے اس کے کمرے تک پہنچا کر جب وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹا تو خود اپنے آپ پر حیران تھا۔ وہ ایسا نہیں تھا وہ اتنا خوش اخلاق اور اتنا مہربان ہرگز نہیں تھا۔ وہ ہر ایرے غیرے کو منہ نہیں لگاتا تھا لیکن اس لڑکی کے لیے وہ اپنے مزاج کے خلاف گیا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ اتنی ساری باتیں کی تھیں اسے

چائے بنا کر پلائی تھی۔ اس کے دل سے غم کے احساس کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر جتنے دن وہ اس کے گھ رہی اس کا اس کے ساتھ یہی رویہ رہا تھا۔

اسے پتا تھا کہ بی بی، ام ایمن کے ساتھ اس کے غیر معمولی اور دوستانہ انداز کو دیکھ کر اس لیے حیران نہیں ہ تھیں کیونکہ وہ توفیق کمال کی بیٹی ہے اور اسی وجہ سے وہ اس کے ساتھ اتنی اچھی طرح پیش آ رہا ہے، مگر وہ خود تھا کہ بات یہ نہیں ہے۔ وہ توفیق کمال کی بیٹی ہوتی یا جس کسی کی بھی، اگر اس کا دل یوں اس کی طرف نہ کھنچتا کبھی اس کی یوں پروا نہ کرتا۔

وہ بہت ذہین تھی، اگر اسے صحیح ماحول اور صحیح لوگ ملتے تو شاید وہ ایسی نہ ہوتی۔ وہ اس سے باتیں کر ہوئے سارا وقت اس کی خوبیاں تلاشتا تھا، جب اس کی کوئی بات اسے مسکرانے پر مجبور کرتی تو اس کی مسکرا دیکھ کر بے اختیار اس کا دل چاہتا کہ وہ اس چہرے پر سے اس مسکراہٹ کو کبھی نہ مٹنے دے۔

وہ باپ سے ملنے سے پہلے کتنی گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ کتنی خوف زدہ تھی۔ وہ اس کا خوف دیکھ رہا تھا مگر وہ ا دور کرنے کے لیے کچھ کر نہیں سکتا تھا اور وہ توفیق کمال بیٹی سے کتنے سرد و سپاٹ انداز میں ملے تھے۔ وہ صو کس طرح سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔ باپ کی بے گانگی اور لاتعلقی نے اسے کتنا صدمہ پہنچایا ہے وہ سمجھ سکتا تھا۔

وہ دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک کر لیا کرتے تھے مگر انہیں اپنی بیٹی کے ساتھ تو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تو نہیں معلوم کہ یہ سرد اور غیر جذباتی انداز ان کی شخصیت کا حصہ ہے۔ وہ توفیق کمال کو کیسے مجبور کرتا کہ وہ اپ سے محبت کریں، اس کا خیال رکھیں۔ اس کے ساتھ وہ یہ رویہ اختیار نہ کریں جو وہ اکثر افراد کے ساتھ کرتے ہ وہ چپ چاپ، بڑے دکھ کے ساتھ اسے اپنے باپ کے ساتھ جاتا دیکھتا رہا تھا۔ اگلے دو دن وہ اس کے لیے سوچ کر مضطرب اور پریشان ہونے سے خود کو روک نہیں پا رہا تھا۔

کتنی بار اس کا دل چاہا کہ وہ اسے فون کر کے اس کی خیریت معلوم کرے۔ اس سے باتیں کرے اور تب پر اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ وہ اپنے سے بہت سال چھوٹی لڑکی سے محبت کر بیٹھا ہے۔ وہ اس سے ملاقات اولین لمحوں سے محبت کر رہا تھا، چاہے یہ بات کتنی بھی ناقابلِ قبول اور ناقابلِ یقین ہو مگر سچ یہی تھا وہ اس جھٹلا نہیں سکتا تھا جس محبت کے بارے میں اسے یقین تھا کہ حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں، وہ اس کے وجو ہونے سے آگاہ ہو گیا تھا۔

وہ اس کے خیال سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس رات اپنی ایک دوست کے ساتھ ڈنر کرنے چلا گی پہلی شادی کا ناکام تجربہ اسے دوسری شادی کا فیصلہ کرنے سے روکتا تھا مگر شادی نہ کرنے کا یہ مطلب نہیں وہ بالکل تنہا، سرد اور بے رنگ زندگی گزار رہا تھا۔ اس فائیو اسٹار ہوٹل کے سوئٹ میں وہ اس لڑکی کے ساتھ تنہا تھا۔ وہ بہت بڑے انڈسٹریلسٹ کی حسین بیٹی جس کا منگیتر امریکہ میں رہتا تھا اور وہ اپنی شادی سے وقت اسی طرح زندگی کو انجوائے کرتے ہوئے گزارنا چاہتی تھی۔ پہلے بھی وہ دو مرتبہ اس کے ساتھ یہاں آ تب وہ اپنی مرضی سے آتا تھا اور آج زبردستی صرف ایک خیال سے پیچھا چھڑانے کے لیے لیکن اس خیال

وہاں آ کر بھی پیچھا نہیں چھڑا پایا تھا اسے اس بے تحاشا حسین اور بولڈ لڑکی سے گھن آ رہی تھی۔ اسے وہی عام اور بالکل سادہ سی لڑکی یاد آ رہی تھی۔

وہ اب وقت گزاری کے لیے بھی کسی دوسری عورت کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اتنی معصوم' اتنی پاکیزہ' اتنی خالص اور وہ خود' وہ اتنا گھٹیا۔

عورتوں کو خود سے قریب رکھنے کے بعد کیا اس لڑکی سے محبت کا دعویدار ہو سکتا تھا؟ وقت گزاری کے لیے اپنے پیچھے آنے والی ان تمام لڑکیوں سے اس نے پیچھا چھڑا لیا تھا اور وہ ام ایمن اس سے وہ کسی لمحہ پیچھا نہیں چھڑا پاتا تھا وہ اس کے خیالوں میں آتی تھی۔ وہ اس کے تصور میں رہتی تھی مگر یہ محبت جس کا وہ خود سے بھی بہت ڈر ڈر کر اعتراف کرتا تھا اسے وہ کسی کے بھی سامنے ظاہر نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی کرنا چاہتا تھا۔ اس لڑکی کے سامنے بھی نہیں۔ وہ اتنی کم عمر' اتنی معصوم' بالکل ان چھوئی اور خالص اس کا حق تھا کہ اسے اپنے ہی جیسے ایک خالص اور سچے مرد سے محبت ملتی۔

وہ اپنی محبت کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دے گا۔ کبھی کسی کو نہیں بتائے گا کہ اس نے زندگی کے اتنے برس گزارنے کے بعد پہلی مرتبہ کسی سے بالکل سچی اور بے غرض محبت کی ہے۔ ام ایمن سے کوئی تعلق نہ رکھنے کا فیصلہ کر کے وہ بہت مطمئن تھا۔ اس کا ضمیر مطمئن تھا۔ وہ اس پیاری سی لڑکی کے لیے دعا ضرور کرتا تھا کہ اس کی زندگی میں سب کچھ اچھا ہو جائے۔

وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ چاہے اس محبت کو وہ کبھی بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا مگر کیا وہ اسے یوں اکیلا چھوڑ دے۔ وہ اس تنہائی اور گھٹن کا شکار ہو کر اگر مر گئی تو وہ خود کو کیسے معاف کر پائے گا۔ پھر اس نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس کی محبت کو اپنے دل میں دفن کر دے گا۔ کہیں بہت گہرائی میں۔ اتنی گہرائی میں جہاں سے کوئی کھوج نہیں پائے گا' مگر اب وہ اس سے لاتعلق نہیں رہے گا۔ وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چلے گا۔ وہ اسے چلنا سکھائے گا۔ وہ اسے ایسا بنا دے گا کہ توفیق کمال اسے فخر کے ساتھ اپنے برابر کھڑا کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اسے زندگی میں سب کچھ ملے گا۔ خوشیاں' سکون' محبتیں۔ باپ کی محبت' بھائی کی محبت' دوستوں کی محبت۔ اس کی سب محرومیاں دور ہو جائیں گی۔ یہی توفیق کمال ہوں گے اور یہی ام ایمن۔ مگر وقت اور حالات بالکل بدل جائیں گے۔ وہ اسی ام ایمن کو اپنے ساتھ بٹھانا' لوگوں سے ملوانا اور اپنی بیٹی کہہ کر متعارف کرانا قابلِ فخر سمجھیں گے۔

وہ ام ایمن کو اپنی دوست بنائے گا۔ وہ اس کے لیے سب کچھ کرے گا۔ اس وقت تک جب تک کہ وہ چلنا نہ سیکھ لے۔ جب تک کہ توفیق کمال اسے اپنی بیٹی کی حیثیت سے قبول نہ کر لیں۔ اس سے دوستی کرنا بہت مشکل تھا۔

وہ کسی ایک کے دل میں بھی یہ شک پیدا ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے ام ایمن سے محبت ہے۔

اس نے توفیق کمال کو جب یہ بتایا کہ وہ ام ایمن کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے فارم دے کر آیا ہے تو انہو تعجب سے اسے دیکھا۔

"ام ایمن اتنے دنوں تک ہمارے گھر پر رہی تو میری اس کے ساتھ کافی دوستی ہو گئی تھی۔ آپ کو میر کے ساتھ دوستی پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟" انہوں نے جواب میں مسکراتے ہوئے یہ کہا تھا کہ "انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" مگر ان کی آنکھیں بڑے تعجب سے اس سے یہ بات کہہ رہی تھیں کہ یہ دوستی ہو وجہ سے ہے؟ ان کی بیٹی کسی بھی لحاظ سے حیدر مسعود کے دوستی کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔

اس نے توفیق کمال کی حیرت کو اس طرح نظر انداز کیا جیسے وہ اسے نظر ہی نہیں آئی ہو۔ وہ اس کو فون کر سے ملتا مگر سب توفیق کمال کے علم میں رکھتے ہوئے۔

وہ آفس میں انتہائی اہم باتوں کے دوران توفیق کمال کے ساتھ ام ایمن کے بارے میں باتیں ش کر دیتا۔ اس نے اپنا اسائنمنٹ کتنا اچھا بنایا ہے' وہ کتنی محنت سے پڑھ رہی ہے' وہ ذہانت کے لحاظ سے اپنے باپ جیسی ہے۔

ان کی آنکھوں میں کبھی کبھار یہ تاثر بھی نظر آتا کہ اسے ان کی بیٹی کی اتنی فکر کیوں رہتی ہے لیکن پھر آ آہستہ یہ حیرت اور یہ ناگواری ختم ہونے لگی۔ توفیق کمال سمیت تمام قریبی افراد نے اس کی ام ایمن کے دوستی کو قبول کر لیا۔

ام ایمن کی عزت اسے اپنی عزت سے بھی زیادہ پیاری تھی۔ وہ ام ایمن سے اس کے لیے ایما ہو گئی تھ اس نام سے بھی وہ اسے سب کے سامنے بے جھجک پکارتا تھا۔

کیا محبت انسان کو اتنا بدل دیتی ہے' اسے اتنا اچھا بنا دیتی ہے' وہ خود پر حیران ہوتا۔ وہ اس کے لیے کت گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اتنا اچھا تھا کہ اپنی اچھائیوں پر خود تعجب کرتا تھا۔

اپنی محبت کے اول روز سے وہ اس کے انجام سے واقف تھا۔ پھر بھی بالکل بے غرض ہو کر بغیر کسی ص خواہش کے یہاں تک کہ بدلے میں اس کی محبت ہی حاصل کرنے کی خواہش کیے بغیر وہ اس کے لیے سب کر رہا تھا۔

اس نے سائرہ کے دل میں ایمن کی محبت جگائی تھی۔ اس کم عمر اور مخلص لڑکے کو یہ بات سمجھائی تھی کہ اپن سے محبت کرنا اس لیے کہ اس کے پاس رشتوں اور محبتوں کی شدید کمی ہے۔ اسے ویسی محبت اور ویسی اپنائیت جیسی ایک پیار کرنے والا بھائی اپنی بہن کو دیتا ہے۔

مگر اس کی تمام تر احتیاط کے باوجود وہ اسے خود سے محبت کرنے سے روک نہیں پایا تھا۔ وہ اس کے قر سب کچھ سوچ سمجھ کر آیا تھا۔ اس نے توفیق کمال' الماس بی بی اور ماریہ ایک ایک کے ردعمل اور ان کے ردعمل جواب میں اپنے ردعمل پر غور کرنے کے بعد اس کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ اس نے سب کے ردعمل کے با میں سوچ لیا تھا اور یہ سوچنا بھول گیا تھا کہ جب وہ اس کے ساتھ اتنا اچھا اور اتنا غیر معمولی سلوک کرے گا تو اس سے محبت نہیں کرنے لگے گی۔ وہ ڈر گیا تھا' وہ بہت بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اس کے دل سے

محبت کیسے نکالے۔ اس سے کیسے کہے کہ تمہیں مجھ سے بہت بہتر ایک شخص ملے گا جو صرف تمہارے لیے ہوگا جو صرف تمہارا ہوگا۔ اس کی زندگی میں تم سے پہلے کبھی کوئی لڑکی نہیں آئی ہوگی۔ جتنی تم خالص ہو ایسا ہی وہ بھی ہوگا۔ وہ کم عمر اور نادان تھی، ابھی اس نے دنیا کہاں دیکھی تھی۔ اس کی زندگی میں آنے والا وہ پہلا مرد تھا اور چونکہ وہ اس کے ساتھ اتنا زیادہ اچھا تھا، اس کا اتنا خیال رکھتا تھا اسی لیے جواب میں وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس نے یہ سوچا تھا کہ آہستہ آہستہ وہ میچور ہونا شروع ہوگی۔ وہ اپنے اردگرد دیکھنے کے قابل ہوگی تو اسے پتا چلے گا کہ دنیا میں حیدر مسعود کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ وہ یہ بھی جان لے گی کہ اس میں اتنی خوبیاں ہیں کہ اسے حیدر مسعود سے کہیں بہتر اور اپنی ہی جیسی عمر کا کوئی شاندار انسان مل سکتا ہے۔

سب کچھ اس کی خواہشات کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ پہلے سے بھی زیاد پر اعتماد ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اپنی صلاحیتوں پر یقین آ گیا تھا۔ توفیق کمال بھی اسے اہمیت دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سب کچھ کتنی اچھی طرح ہو رہا تھا اور اسی طرح ہوتا بھی رہتا اگر بجیلہ اس روز اس کے آفس میں نہ آئی ہوتی۔ وہ اس سے اپنی مرضی سے الگ ہوئی تھی مگر اب بلاوجہ اس کے پیچھے آ کر اس کا وقت برباد کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اسے بجیلہ بابر سے اب محبت تھی نہ نفرت۔ وہ اس کا گزرا کل تھی اور وہ ماضی میں زندہ رہنے والے لوگوں میں سے نہیں تھا۔

وہ آفس میں آئی اور اس کی اتنے عرصے کی ساری محنت برباد کر گئی۔ کتنے اطمینان سے اس نے وہ ساری باتیں کہہ دیں جو وہ ایمن سے کہنے کا کبھی تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے اور ایمن کے تعلق میں کبھی محبت کے لفظ کو داخل نہیں ہونے دیا تھا مگر اس روز بجیلہ اس لفظ کو ان کے درمیان لے آئی تھی۔

وہ اب کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا جو بات اسے کہنا تھی وہ بات وہ کہہ چکی تھی۔ اپنی محبت کو دل کی گہرائیوں میں چھپائے رکھنے کی اس کی ساری محنت اور کوشش بے کار چلی گئی تھی۔ ایمن اس کے پاس آ رہی تھی، وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی اور وہ اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ وہ بجیلہ کی باتوں سے اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ اس کا ایمن سے بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

وہ خود پر یہ الزام سہنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس نے ایمن کی کم عمری اور معصومیت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنی اور ایمن کی دوستی کو داغدار ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی اجنبیت اور اس کی لاتعلقی ایمن کے دل کو کتنا دکھ پہنچا رہی ہے وہ جانتا تھا مگر وہ سنجیدگی کے ساتھ بہت کچھ سوچ رہا تھا اور پھر اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ شادی کرنے کا فیصلہ۔ اسے شادی کر لینا چاہیے تاکہ پھر سے کوئی اس کی اور ایمن کی دوستی پر کوئی بے ہودہ تبصرہ نہ کر سکے۔

اس نے شادی کے لیے فاطمہ مصطفیٰ کا انتخاب کیا تھا۔ وہ اس کی واقعی بہت اچھی دوست تھی۔ وہ ذہین تھی، باصلاحیت تھی۔ حیدر خود اسے اپنی کمپنی میں لایا تھا۔ اس کی بجیلہ سے علیحدہ ہو گئی تب ایک بار فاطمہ نے اس سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی اور تب بھی اس نے اسے منع کر دیا تھا۔ اب جو اس نے شادی کے بارے میں سوچا تو فاطمہ اسے اپنے جاننے والی تمام لڑکیوں میں سب سے بہتر لگی۔ وہ اچھی بیوی بن سکتی تھی۔

وہ اس فیصلے کے بعد ام ایمن کی زندگی سے نکلنا چاہتا تھا کیونکہ اب وہ اپنی زندگی جی رہی تھی۔
ساتھ اپنے تعلق کو پہلے کے مقابلے میں محدود کر دینا چاہتا تھا تاکہ اسے شادی کے بعد اپنے شو
ایڈجسٹ ہونے میں مشکل پیش نہ آئے۔ بی بی اور ماریہ کی رائے وہ پہلے ہی لے چکا تھا۔ اس کا ار
جلد شادی کرنے کا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کی شادی کی خبر اسے شاک پہنچائے گی مگر کوئی بات نہیں
گزرے گا تو وہ خود ہی حیدر مسعود کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی کو حماقت قرار دینے لگے گی۔

اسے شاک پہنچے گا، اس نے یہ سوچا تھا، وہ روئے گی، اس نے یہ سوچا تھا مگر وہ اس کے پاس آ کر
وجہ دریافت کرے گی۔ یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اسے اس سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح ا
آ کر وہ سب کچھ کہے گی۔ جو جرأت اور جو اعتماد اس نے اس کے اندر پیدا کیا تھا وہ اسی کا اس کے س
کر رہی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل
واضح الفاظ میں اس سے اپنی محبت کا اقرار کر رہی تھی۔ اس کے سخت لہجے میں سمجھانے اور ڈانٹنے
چہرے پر سے جیسے سارا خون ہی نچوڑ لیا تھا۔ وہ اسے پیار سے پاس بٹھا کر سمجھانا چاہتا تھا، مگر وہ کچھ
تیار نہیں تھی۔ وہ اس سے جواب مانگ رہی تھی اس بات کا کہ وہ اس سے شادی کرے گا یا نہیں، اس
اس سے محبت کرتا ہے یا نہیں اور جواب اسے صرف ''ہاں'' یا ''نہیں'' میں چاہیے تھا۔ وہ ان دو میں
لفظ سننے کے علاوہ اور کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ سچ وہ بول نہیں سکتا تھا اور اس کا جھوٹ ا
دوچار کر دے گا وہ جانتا تھا پھر بھی وہ اس جھوٹ کو بولنے کے لیے مجبور تھا۔

پھر ان گزرے پندرہ دنوں میں نہ وہ آفس آئی تھی اور نہ حیدر خود میں اتنی ہمت پیدا کر پایا تھا
کر سکے۔ اس سے ملنے اور اس کی نگاہوں میں موجود کرب اور غم دیکھنے کا تو اس میں حوصلہ ہی نہیں
دیکھ پائے گا اس کی نگاہوں میں اپنا ہی دیا ہوا غم اور دکھ۔ وہ اسے کبھی بھی کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا تھ
تکلیف سے بچانا چاہتا تھا لیکن وہ ہی اسے دکھ اور تکلیف میں مبتلا کر گیا ہے۔ یہ بات وہ برداشت
تھا۔ بی بی کے ہر روز یاد دلانے کے باوجود بھی وہ فاطمہ کو فون نہیں کر پا رہا تھا۔ بی بی کہہ رہی تھیں ک
کے آنے سے پہلے اسے فاطمہ سے بات کر کے شادی کی تاریخ طے کر لینی چاہیے۔

وہ فاطمہ سے بات کرنے کے لیے خود کو آمادہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کا دل، دماغ اس کا پورا وجود ا
کے لیے پریشان تھا جسے پچھلے پندرہ دنوں سے نہ اس نے دیکھا تھا اور نہ اس کی آواز سنی تھی۔

اس نے توفیق کمال کو پریشان دیکھا تو پتا نہیں کیوں اسے ایسا لگا کہ وہ ایمن ہی کی وجہ سے پ
ایمن اب ان کے لیے بہت اہم تھی۔ وہ اب پہلے والی ام ایمن نہیں رہی تھی جس کی انہیں کوئی پروا
تھی۔ ایمن اب ان کے لیے ان کا آنے والا کل تھی۔ ایمن اور سارا ان کی امیدوں کا مرکز تھے۔

وہ ان پندرہ دنوں میں ایمن کے لیے صرف پریشان اور فکرمند رہا تھا مگر اب؟ اب جو ہونے
نے اسے پورے کا پورا ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔ وہ تنہا اتنا بڑا فیصلہ کر گئی تھی۔ وہ

کر جا رہی تھی۔ اس وقت جب زندگی بانہیں پھیلائے اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ وہ اب تنہا نہیں تھی اس کے گرد اس کے چاہنے والوں کا ہجوم تھا۔ اس کی فکر کرنے والے بہت لوگ اس کے پاس تھے پھر بھی وہ جان بوجھ کر خود کو تنہا کرنے جا رہی تھی۔

فرق صرف یہ تھا کہ پہلے جو تنہائی اسے ملی تھی وہ اس کے نصیب میں لکھی ہوئی تھی اور اب کی بار وہ جان بوجھ کر خود کو تنہا کر رہی تھی۔ وہ اسے کیسے روکے۔ وہ اسے کیسے سمجھائے کہ ایسا مت کرو۔ خود پر یہ ظلم مت کرو۔ وہ اب اس کی کوئی بات نہیں سنے گی۔ وہ جانتا تھا پھر بھی وہ اسے یہ بے وقوفی کرتے ہوئے خاموشی سے دیکھ نہیں سکتا تھا۔

* * *

شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے جب وہ توفیق کمال کے گھر پہنچا۔ پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے وہ آگے بڑھا تو اسے لان میں توفیق کمال اور الماس کے ساتھ بی بی بھی بیٹھی نظر آئیں۔ وہ آفس سے سیدھا وہیں چلا آیا تھا۔ اسے بی بی کی یہاں موجودگی کا علم نہیں تھا۔

"السلام علیکم۔" وہ ان لوگوں کے پاس آ گیا۔ توفیق کمال آج آفس میں بہت تھوڑی دیر رک کر گھر واپس آ گئے تھے۔ ان کے چہرے پر پھیلی پریشانی اسے بہت واضح نظر آ رہی تھی۔

"تم نے مجھے بتایا نہیں حیدر کہ ایمن نے حیدر آباد میں جاب کر لی ہے اور وہ کل وہاں جا رہی ہے۔"

بی بی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ وہ شاید یونہی الماس اور ایمن سے ملنے آج یہاں آ گئی تھیں اور یہاں آ کر ملنے والی اس خبر نے انہیں بری طرح حیران کیا تھا۔ وہ ان کے اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ وہ خود بہت الجھا ہوا تھا۔ "توفیق بھائی میں ایما سے ملنے آیا ہوں اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس سے مل لوں؟" اسے یقین تھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہوگی اور کسی کے بھی بلانے پر اس سے ملنے کمرے سے باہر نہیں آئے گی۔

"وہ اپنے کمرے میں ہے۔" انہوں نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ ان تینوں کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر اندر آ گیا تھا۔

"یہ کیا پاگل پن ہے ایما!" اس نے گردن موڑ کر آنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ غصہ اور جھنجلاہٹ چہرے پر لیے اس کے پاس آ رہا تھا۔ وہ گردن گھما کر الماری سے اپنے ہینگ شدہ کپڑے نکالنے لگی۔

"رشیدہ! یہ دوپٹے سارے تہ کر کے ایک جگہ رکھنا ورنہ مجھے ڈھونڈتے ہیں مشکل ہوگی۔" اس نے الماری سے اکٹھے تین چار ہینگرز نکال لیے تھے۔ وہ اس کے بالکل قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ ہینگرز میں سے کپڑے نکال کر بیڈ پر اچھالنے لگی۔ وہ اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ اس سے مزید کچھ کہنے سے پہلے وہ رشیدہ کی طرف گھوما۔

"تم جاؤ یہاں سے۔" وہ فوراً باہر نکلنے لگی تھی کہ ایمن کی غصہ بھری آواز نے اسے روک دیا۔

"کہاں جا رہی ہو۔ یہ کپڑے رکھواؤ میرے ساتھ۔" وہ بے چاری ہونق نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔

مالکوں کے جھگڑے میں ملازموں کی موجودگی مناسب نہیں' یہی سوچ کر وہ اگلے لمحے کمرے سے باہر چلی گئی۔

اس نے رشیدہ کو کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تو مزید غصے میں آ گئی۔ غصے میں اس نے کھینچ
سے کپڑے نکالنے شروع کر دیے۔

"کیوں تم یہ بے وقوفانہ حرکتیں کر رہی ہو؟ تمہیں پتا ہے ہم سب تمہاری وجہ سے کتنے پریشان ہیں

وہ اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کپڑے نکالتی رہی۔

"میں تم سے بات کر رہا ہوں ایما!" وہ ایک دم سیدھی ہوئی اور اس کی طرف مڑی۔

"ام ایمن۔ ام ایمن نام ہے میرا' ایما کہنے کا حق میں نے صرف اس شخص کو دیا تھا جس کے بار
یہ یقین تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔" اس کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی۔ وہ آنکھوں میں غصہ لیے
اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور نہ اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

"مجھے پتا ہے تم مجھ سے ناراض ہو لیکن......"

"ناراض......؟" وہ اس کی بات کاٹ کر استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"ناراضی کے لیے آپس میں کسی رشتے کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے حیدر مسعود اور ہمارے
ہی نہیں ہے۔"

"دیکھو ایما......!"

"ام ایمن......" وہ غصے سے چیخی۔ چند سیکنڈز تک اس نے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش
بولی تو اس کا لہجہ بہت ہموار تھا۔

"میں اس بڑے شہر میں روتی ہوئی تنہا آئی تھی اور تنہا ہی جا رہی ہوں مگر بے فکر رہیں میں رو
نہیں جاؤں گی۔ میں نے دعا مانگی تھی کہ مجھے زندگی میں دوبارہ کبھی آپ کی شکل نظر نہ آئے مگر میری
ہوئی۔ آپ میرے مسیحا' میرے ہمدرد اور غم گسار بنے پھر میرے سر پر موجود ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ
چاہتے کیا ہیں؟" وہ طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ لب بھینچے بالکل خاموش کھڑا تھا۔
کپڑوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"اس بڑے شہر کے طور طریقے میں سیکھ نہیں سکی۔ آپ کے بہت سکھانے کے باوجود بھی اندر
چھوٹے شہر کی رہنے والی۔ چھوٹی چھوٹی سی باتوں کو دل سے لگا لینے والی۔ کوئی اچھی طرح بات
اخلاق برتے تو مجھے لگتا ہے اسے مجھ سے محبت ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر جذباتی ہو
کلاس ذہنیت کبھی نہیں بدل سکتی۔" وہ کپڑے تہ کرتے ہوئے استہزائیہ ہنسی۔

"آپ کو میرے جانے پر اتنا غم کیوں ہو رہا ہے میں یہ بھی جانتی ہوں۔ میرے چلے جا
پروجیکٹ جو ادھورا رہ جائے گا۔ ابھی میں نے MBA کر کے آپ کے کندھے پر موجود ستاروں
ستارے کا اضافہ جو نہیں کیا۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں ہنسی۔

"تم بہت غلط بات کہہ رہی ہو ایما! تمہیں خود احساس نہیں ہے' غصے اور ناراضی کا یہ مطلب
میرے خلوص کی توہین کرو۔" ایمن کی اس بات نے اسے بہت دکھ دیا تھا۔ وہ آنکھوں میں کرب

رہا تھا۔

’’خلوص؟ ہمارے درمیان خلوص نام کی کوئی چیز کبھی موجود ہی نہیں تھی۔ میں آپ کا ایک پروجیکٹ ہوں حیدر مسعود! آپ کا خود اپنے آپ کو دیا ہوا ایک اسائنمنٹ جس تعلق کو میں خلوص، دوستی اور محبت کا تعلق سمجھتی تھی وہ اصل میں ہے کیا میں کبھی سمجھ ہی نہیں سکی۔

آپ جو کہتے گئے میں بغیر سوچے سمجھے کرتی گئی۔ یہ سوچ کر کہ یہ شخص مجھ سے خلوص کی آخری حدوں تک مخلص ہے۔ یہ کبھی مجھ سے کچھ غلط کہہ ہی نہیں سکتا۔ مجھے کبھی معلوم ہی نہیں ہوا کہ میں حیدر مسعود کا ایک پروجیکٹ ہوں، جس کی تکمیل پر اس کا سر فخر سے اونچا ہو جائے گا۔ کیا حقیقت ہے ام ایمن کی۔ حیدر مسعود کے اشاروں پر ناچنے والی ایک کٹھ پتلی۔‘‘

’’کاش تم یہ سمجھ سکتیں کہ تمہاری یہ باتیں مجھے کتنا دکھ دے رہی ہیں، پھر شاید تم کبھی مجھ سے یہ سب کچھ نہ کہتیں۔ میں شاید تمہیں کبھی بھی یہ سمجھا نہیں سکوں گا کہ تم میرے لیے کیا ہو؟‘‘

وہ اس کی نفرت اور حقارت سے کی گئی باتوں کے جواب میں آہستگی سے بولا۔

’’کوشش کیجیے شاید سمجھ جاؤں۔‘‘ وہ کرب سے ہنس دی۔

’’میں اپنے باپ کو برا انسان سمجھتی تھی۔ ان سے شاکی رہتی تھی مگر آپ...... آپ تو ان سے بھی برے انسان ہیں۔ انتہائی خطرناک، دوستی اور خلوص کا نام لے کر آپ نے مجھے بے وقوف بنایا، میرے جذبات کا مذاق اڑایا، وہ میرے ساتھ برے تھے تو کھلے عام ڈنکے کی چوٹ پر برے تھے۔ آپ نے تو اچھائی کی آڑ میں میرے ساتھ وہ برائی کی ہے کہ مجھے خود اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی ہے۔ بعض لوگوں کو شوق ہوتا ہے ناں کہ ان کی واہ واہ ہو۔ ان کی ہر جگہ تعریفیں ہوں اور ہو رہی ہیں آپ کی تعریفیں۔ جہاں کہیں میری خوبیوں کو سراہا جاتا ہے، وہاں خود بخود ہی حیدر مسعود کا نام بھی آ جاتا ہے۔ کتنے جوہر شناس ہیں آپ میرے باپ نے یقیناً آپ سے یہ بھی کہا ہو گا کہ آپ میں کسی بھی انسان کی قابلیت کو جانچنے کی صلاحیت ان سے بھی زیادہ ہے۔ کتنا اچھا لگتا ہو گا اس وقت جب......

’’بس کرو ایما!‘‘ وہ اس کی بات کاٹ کر بہت زور سے چلایا اس کے چہرے پر موجود دکھ اور کرب کی جگہ بے تحاشا غصے نے لے لی تھی۔ وہ مٹھیاں بھینچے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

’’جب تم کچھ بھی نہیں جانتی ہو تو پھر اتنے یقین سے کچھ بولو بھی مت۔‘‘ وہ انتہائی طیش کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔

’’کیا نہیں جانتی میں؟ میں سب کچھ جانتی ہوں آپ کے بارے میں۔ آپ ابھی بھی جمیلہ بابر سے محبت کرتے ہیں تب ہی تو اس سے علیحدگی کے بعد اتنے سالوں تک آپ نے دوسری شادی نہیں کی لیکن جب وہ آپ کے پیچھے آئی تو آپ نے اسے دوبارہ قبول نہیں کیا۔ اس لیے کہ آپ کے اندر کے انا پرست مرد کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی کہ وہ آپ کو چھوڑ کر ایک دوسرے آدمی کے پاس چلی گئی تھی۔ آپ ایک انا پرست اور مغرور انسان ہیں۔ فاطمہ سے شادی آپ کسی محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے کر رہے ہیں۔ میں زبردستی آپ کے گلے پڑنے کی کوشش جو کرنے لگی تھی۔ خوش ہو جائیں اب میں جا رہی ہوں یہاں

سے۔ آپ کو مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے کسی سے شادی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘
’’مجھے جمیلہ سے کبھی محبت نہیں تھی۔ نہ کل نہ آج۔‘‘ وہ غصے میں تو ابھی بھی تھا مگر اس بار وہ چلایا نہیں
’’میں نے صرف تم سے محبت کی ہے، صرف تم سے۔‘‘ وہ ہار گیا تھا۔ وہ اس کی بدگمانیاں نہیں سہہ سکتا
’’یہ شاید آپ کا مجھ سے ایک اور جھوٹ ہے۔ مجھے جانے سے روکنے کے لیے فوری طور پر شاید یہی
آپ کی سمجھ میں آئی ہے کہ مجھ سے محبت کی بات کر لی جائے۔‘‘ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر الماری
گھومنے لگی مگر اس نے ایک دم ہی اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کر لیا۔ اپنے بالکل سامنے۔
’’تم میری طرف دیکھو۔ میری آنکھوں میں دیکھ کر بتاؤ کیا تمہیں ان میں محبت نظر نہیں آتی؟‘‘ و
کندھوں پر بڑی سختی سے ہاتھوں کو جمائے کھڑا تھا۔
’’ہاں نظر آتی تھی تب ہی تو اس روز آپ کے پاس گئی تھی۔ آپ کے قدموں تلے اپنی انا اور اپنی ع
کو کچلوانے کے لیے۔‘‘ اتنی دیر میں پہلی مرتبہ اس کی آنکھیں اور اس کی آواز بھیگی تھی۔ ان بھیگی ہوئی نگا
اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو ان میں اپنا ہی عکس نظر آیا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ا
کے کندھوں پر سے اپنے ہاتھ نہیں ہٹائے تھے۔
’’میرے لفظوں پر اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو میری آنکھوں پر یقین کر لو۔
’’اگر یقین کر لوں تو یہ میرے لیے مزید دکھ کی بات ہو گی۔ ایک بزدل مرد مجھ سے محبت کرتا ہے ج
کمرے میں کسی گناہ کی طرح اپنی محبت کا اعتراف کر رہا ہے جس میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ وہ لوگوں
اپنی محبت کا اقرار کر سکے۔ میں بزدل مردوں سے نفرت کرتی ہوں حیدر مسعود!‘‘ اس نے اپنے کندھو
اس کے ہاتھ ہٹانے چاہے۔ اس کی کسی کوشش سے پہلے اس نے خود اس کے کندھوں پر سے ہاتھ ہٹا د
کا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ اسے کمرے کے دروازے کی طرف لے جا رہا تھا۔
’’آپ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں؟‘‘ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چلائی۔ وہ ا
کا جواب دیے بغیر اسے اسی طرح گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا تھا۔
راستے میں نظر آتے کسی ملازم کی حیرت کی اس نے پروا نہیں کی تھی۔ سیڑھیوں سے اتر کر ڈرائ
سے پھر لان کی طرف جانے والے دروازے کی طرف وہ تیز قدموں سے بڑھتا گیا۔ وہ تکلیف سے
کے ساتھ گھسٹتی ہوئی لان میں آ گئی تھی۔ وہاں بیٹھے تینوں افراد اپنی گفتگو بھول کر ان دونوں کو حیرت
رہے تھے۔ وہ توفیق کمال کی کرسی کے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی طرح اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے
’’میں آپ کی بیٹی سے محبت کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ وہ پر اعتماد اور بے خ
میں بولا۔ اس کی اس غیر متوقع بات نے توفیق کمال، الماس اور بی بی کو تو سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا کی
ایمن بھی سکتے کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔ اس طرح گھسیٹ کر یہاں لانے کا مقصد یہ بات ہو گی ا
وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔
اسے پتا ہی نہیں تھا کہ اس کا دیا بزدلی کا طعنہ اسے اس قدر مشتعل اور جذباتی کر دے گا۔ ان تینو

سب سے پہلے توفیق کمال ہی سکتے کی کیفیت سے باہر نکلے تھے۔

”یہ کسی باپ سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگنے کا مہذبانہ طریقہ تو ہرگز نہیں ہے برخوردار! شریف لوگ اس مقصد کے لیے اپنے بزرگوں کو بھیجتے ہیں۔“ ان کے چہرے کی مبہم سی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ انہیں اس کی جرأت بہت پسند آئی ہے۔

”بی بی یہاں موجود ہیں اور وہی میری بزرگ ہیں۔ کیوں بی بی! آپ کو کیا اس شادی پر کوئی اعتراض ہے؟“ وہ ایمن کی ہاتھ چھڑانے کی کوشش پر اسے گھورتے ہوئے بی بی سے مخاطب ہوا۔

”ہرگز نہیں۔ ایمن مجھے بہت پسند ہے۔ میرے لیے تو یہ بہت خوشی کی بات ہے۔“ وہ جواباً مسکراتے ہوئے بولیں۔ اب تو آپ کو اس رشتے کو قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے؟“ اس نے توفیق کمال کی طرف دیکھا۔ ایمن سر جھکائے ہوئے پریشانی کے عالم میں توفیق کمال کا جواب سن نہیں پائی۔ شرمندگی اور خجالت سے اس کا برا حال تھا۔ وہ کسی بھی طرح اپنا ہاتھ چھڑا کر یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر اس کی مضبوط گرفت کے آگے اس کی تمام تر کوششیں بے کار ثابت ہو رہی تھیں۔

”بی بی! آپ اپنے ہاتھ سے کوئی سی بھی ایک انگوٹھی اتار کر مجھے دے دیں۔ میں یہ رشتہ ابھی اور اسی وقت پکا کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ نظریں گھاس پر جمائے اس کی بات اور الماس اور بی بی کی دبی دبی ہنسی کی آوازیں سن رہی تھی۔ بی بی نے ہنستے ہوئے اپنے ہاتھ میں موجود سب سے قیمتی انگوٹھی اتار کر اسے دے دی۔ اس نے فوراً ہی اس کے ہاتھ کو اپنے سامنے کر کے اسے انگوٹھی پہنا دی۔ بی بی کی انگوٹھی اسے اتنی ڈھیلی تھی کہ وہ ہاتھ کو ذرا سا بھی ہلاتی تو وہ نیچے گر جاتی۔

”اب اس بات کا طعنہ دینے مت بیٹھ جانا کہ تمہیں بی بی کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ ابھی جا کر تمہارے لیے نئی انگوٹھی خرید لوں گا تب تک اسے پہنے رہو۔“ وہ اس لہجے میں بولا جیسے وہ آج تک پتا نہیں اسے کس کس بات کے طعنے دیتی آئی تھی۔

”توفیق بھائی میں چاہتا ہوں کہ یہ شادی جلد ہی ہو جائے۔ اگلے مہینے مجھے اٹلی جانا ہے۔ میں وہاں اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں۔“ وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور وہ کسی کی بھی طرف دیکھے بغیر دروازے کی طرف بھاگی تھی۔ وہ اسے بھاگتا ہوا دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کی اس جرأت اور بہادری نے ایمن کو جو بے تحاشا خوشی دی تھی وہ اسے جانتا تھا اور صرف ایمن ہی تو خوش نہیں تھی وہ خود بھی تو اپنے اس فیصلے پر بے انتہا خوش تھا۔

بعض فیصلے کتنے آناً فاناً اور بالکل اچانک ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی فیصلہ تو یہ بھی تھا۔ جس فیصلے کے خلاف دینے کے لیے اس کے پاس ہزاروں دلائل تھے وہ آن واحد میں اپنے سارے دلائل اور سارے اعتراضات بھول کر وہی فیصلہ کر بیٹھا تھا۔ یہ ان ہونی جب ہو گئی تو کتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔ یہ سب کتنا خوش کن اور حسین تھا۔ اب اسے اپنی محبت کو چھپانے اور اپنے جذبوں پر پہرے بٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اپنی محبت پر لگائی خود ساختہ پابندیوں کو ہٹانے کے بعد اب وہ اس سے وہ سب کچھ کہنے کے لیے بے قرار تھا جو اس سے کبھی کہہ نہیں پایا تھا۔

* * *